صفر المظفر ۱۴۴۳ھ
ستمبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

قرآن اور سُنّت کا باہمی تعلق

بانی تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 70

شمارہ : 9

صفر المظفّر 1443ھ

ستمبر 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی مُعاوِن:

حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: **www.tanzeem.org**

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ!! — ایوب بیگ مرزا

تذکرہ و تبصرہ — 9

قرآن وسُنّت کا باہمی تعلق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بیانُ القُرآن — 33

سورۃ الحدید (آیات ۱ تا ۱۱) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مآخذِ شریعت — 54

دین میں حدیث وسُنّت کا مقام — عبدالرشید عراقی

حقیقتِ دین — 73

دعا: عبادت کا مغز — احمد علی محمودی

علومِ قرآنی — 82

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۴) — پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَہَقَ الۡبَاطِلُ!!

نبی اکرم ﷺ نے ایک تمثیل کے ذریعے ہمیں سمجھایا ہے کہ انسان پر جب خوشی کے جذبات شدّت سے غالب آجائیں اور وہ خوشی اُس کی رگ و پے میں سما جائے تو اُس کے حواس مکمل طور پر قابو میں نہیں رہتے۔ وہ کہنا کچھ چاہتا ہے اور اُس کے منہ سے نکلتا کچھ اور ہے۔ وہ تمثیل کچھ یوں ہے کہ اگر صحرا کے کسی مسافر کا خوراک اور سامان سے لدا ہوا اونٹ اُس وقت گم ہو جائے جب وہ سستا رہا ہو اور وہ اُسے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کرے لیکن ناکام ہو جائے اور اب موت کا انتظار کرنے لگے‘ پھر اچانک وہ اونٹ اُس کے سامنے آ کھڑا ہو تو خوشی کے جذبات اُس پر اِس قدر غالب آجاتے ہیں کہ وہ غلطی سے یہ کہہ اُٹھتا ہے: اے اللہ! تُو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں!

حقیقت یہ ہے کہ افغان طالبان کی فتح پر شدّتِ جذبات سے آج عالمِ اسلام اور خاص طور پر مسلمانانِ پاکستان پر یہی کیفیت طاری ہے۔ زبان اور قلم کی نوک اپنی بے بسی کا اظہار کر رہی ہیں کہ خوشی اور تشکّر کے اِن جذبات کو الفاظ کا لبادہ کیسے اُوڑھایا جائے۔ کیا کہا اور لکھا جائے کہ جذبات کی صحیح ترجمانی ہو سکے۔ بہرحال یہ اپنی اپنی صلاحیت اور زبان وکلام پر دسترس کا معاملہ بھی ہے اور اِس کے لیے لغت سے گہری شناسائی بھی درکار ہے جس سے ہم تہی دامن ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام دشمن اور افغان طالبان سے بغض رکھنے والوں کا بھی اخلاقی تقاضا ہے کہ وہ کم ازکم اُن کی اپنے نظریہ سے وابستگی یعنی commitment کو تو خراجِ تحسین پیش کر دیں۔ ہم بحیثیت مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے پسماندہ ترین ملک افغانستان سے تعلق رکھنے والے افغان طالبان نے امریکہ کی سربراہی میں نیٹو کے ۴۸ ممالک کی فوج جو جدید ترین اور انتہائی مہلک اسلحہ سے لیس تھی اُسے ذلّت آمیز اور عبرتناک شکست دی ہے اور بیس سال کے بعد غاصبوں سے اپنے ملک کا قبضہ چھڑوا لیا ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ ربّ العزت کی مدد اور

نصرت سے ممکن ہوا۔ درحقیقت قرآنِ پاک اور احادیثِ نبوی اِس بات پر شاہد ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ اس حالت میں جہاد کرے کہ قوتِ ایمانی سے لبریز ہو اور اُس کا اصل اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہو تو اللہ کی مدد اور نصرت اُن کو نصیب ہوتی ہے اور فتح مبین اُن کا مقدّر بن جاتی ہے‘ چاہے دنیا بھر کی طاغوتی قوتیں مقابلے پر کیوں نہ ہوں۔

امریکہ کے افغانستان پر حملے کا سارا معاملہ نائن الیون سے شروع ہوا جب نیو یارک میں ٹوئن ٹاورز سے جہاز ٹکرائے اور وہ زمین بوس ہو گئے جس سے کئی ہزار لوگ ہلاک ہو گئے۔ امریکہ نے اِس کو خود پر حملہ قرار دیا اور انتقام لینے کا اعلان کیا۔ امریکہ کو تمام دنیا کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں۔ اُس نے افغانستان میں مقیم اُسامہ بن لادن کو اِس واقعہ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اُس وقت افغانستان میں مُلّا عمر کی قیادت میں افغان طالبان کی حکومت تھی جس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اُسامہ کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔ ملا عمر کا جواب تھا کہ اُسامہ ہمارا مہمان ہے‘ اگر اُس کے خلاف شواہد پیش کیے جائیں تو ہم خود اُس کے خلاف مقدّمہ چلائیں گے۔ لیکن امریکہ صرف طاقت کی زبان بول رہا تھا اور اُسامہ کی فوری طور پر حوالگی پر اصرار کر رہا تھا‘ جس پر مُلّا عمر نے ایک ہزار علماء کا مشاورتی اجلاس بلایا کہ ہمیں شرعی نقطۂ نظر سے کیا کرنا چاہیے! تین دن کی مشاورت کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ اُسامہ کو امریکہ کے حوالے تو نہ کیا جائے البتہ اُسے افغانستان سے نکال دیا جائے۔ اس پر امریکہ نے پینترا بدلا اور وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے ہنگامی پریس بریفنگ میں کہا کہ ہمارا مقصد صرف اُسامہ کی حوالگی نہیں بلکہ افغانستان سے القاعدہ کا نیٹ ورک ختم کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے‘ لہٰذا ہم افغانستان میں فوج لازماً اُتاریں گے۔ گویا امریکیوں کی نیت کھل کر سامنے آ گئی۔ اصل مقصد افغانستان پر قبضہ تھا اور اُسامہ کی حوالگی محض عذرِ لنگ تھا۔ پھر سازش کے پرت کھلتے چلے گئے اور جلد ہی یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ نائن الیون ایک ڈراما تھا۔ ہر ذی عقل انسان اب تسلیم کرتا ہے کہ یہ Inside Job تھا اور نیو ورلڈ آرڈر دنیا پر مسلّط کرنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا گیا۔

پھر عالَمِ اسلام کو تباہ و برباد کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ عراق، لیبیا، شام میں تو تباہی و بربادی پھیلائی گئی‘ البتہ افغانستان پر باقاعدہ قبضہ کیا گیا اور وہاں غدارانِ وطن پر مشتمل ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی گئی۔ امریکہ نے اپنے افغانستان میں آنے کا مقصد جمہوریت کا قیام اور

نیشن بلڈنگ اور مہذب و جدید معاشرے کا قیام بتایا۔ ہماری رائے میں امریکہ اِس بات سے خوفزدہ ہوا تھا کہ افغانستان میں جو اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہوتا نظر آ رہا ہے یہ خطے کے دوسرے خاص طور پر مسلمان ممالک کو متاثر کرے گا‘ لہٰذا اُن کے سرمایہ دارانہ نظام کو خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام جو امریکہ اور یورپ کو دنیا پر مسلّط کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے اُنھیں یقین ہے کہ یہ استحصالی نظام ہی اُن کی اگلی صدی میں سپریم اور غالب اتھارٹی کو بحال رکھے گا بلکہ مزید بڑھاوا دے گا۔ اِس نظام کی حفاظت میں اُنھوں نے کمیونزم سے تصادم مول لیا تھا اور سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کیا تھا۔ لہٰذا وہ افغانستان میں ایسا نظام گوارا نہیں کر سکتے تھے جو کسی وقت بھی اور دنیا کے کسی حصّہ میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرہ بن سکے۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ چین جو اقتصادی ترقی کی بے مثل اُڑان بھر رہا ہے اُس کا گھیراؤ کیا جائے اور افغانستان پر قبضہ کر کے چین کا وسطی ایشیا کی طرف بڑھنا روکا جائے‘ اُس کی اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کی جائے‘ کیونکہ نظریاتی حریف اگر اقتصادی ترقی کر جائے تو اُس کا اگلا ہدف عسکری قوت کا حصول ہوتا ہے جس سے امریکہ یا کم از کم اُس کے اتحادیوں کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ امریکہ کی افغانستان میں آمد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کی بغل میں بیٹھ کر اُس کی ایٹمی قوت کا تیا پانچہ کیا جا سکے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے امریکہ نے ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا اور اپنی بھرپور فضائی قوت کو استعمال کر کے اور زمین پر شمالی اتحاد کے غدارانِ وطن سے مدد لے کر افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ افغان طالبان منتشر ہو گئے۔ امریکہ نے سمجھا اُس نے جنگ جیت لی ہے اور اب وہ تا قیامت افغانستان پر قابض رہے گا‘ حالانکہ اُس نے جنگ نہیں لڑائی جیتی تھی اور طالبان جنگی حکمت عملی (strategy) کے تحت وقتی طور پر پسپا ہوئے تھے۔ اُن کی پالیسی اِس انگریزی محاورے کی بنیاد پر تھی ’’We will live to fight another day‘‘ بہرحال امریکہ اور اُس کے اتحادی ابھی دادِ عیش دے رہے تھے اور دنیا اُن کی قوت‘ جنگی صلاحیت اور اُن کی عظمت کے گیت گا رہی تھی اور خود امریکہ متکبّرانہ بول بول رہا تھا‘ تب طالبان مُلّا عمر کی قیادت میں مجتمع ہوئے‘ اُنھوں نے گوریلا جنگ شروع کی اور جراٴت و بہادری کی وہ مثالیں پیش کیں اور

نیٹو فوج کو یوں ناکوں چنے چبوائے کہ جنگوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔

امریکہ جس شان و شوکت سے میدانِ جنگ میں اُترا اور شکست فاش کے بعد جس طرح ذلیل و خوار ہوا ہماری آنکھوں کے سامنے قرآن کریم کا کھینچا ہوا وہ نقشہ آ گیا۔ فرعون کے دور میں قارون بڑی شان و شوکت اور پُرجلال انداز میں اپنی بے انتہا دولت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکلا تھا اور ایک دنیا اُس کی قسمت پر اَش اَش کر رہی تھی اور اُس کے گُن گا رہی تھی، لیکن جلد اللہ تعالیٰ نے اُس کو مال و دولت سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ امریکہ کی بھی عزّت، تکبّر اور شان و شوکت زمین میں ایسے ہی دھنس گئی ہے۔ یہ شکست درحقیقت صرف امریکہ کی شکست نہیں بلکہ یہ نیٹو کی شکست بھی ہے۔ یہ امریکہ کے اس خطے میں پٹھو بھارت کی بھی شکست ہے۔ یہ امریکہ کی حمایت یافتہ افغان حکومت کی شکست بھی ہے۔ یہ ہر طالبان مخالف گروپ کی شکست ہے۔ یہ اُس کولیشن کی شکست بھی ہے جو نائن الیون کے بعد War against Terror کے نام سے بنائی گئی تھی۔ یہ اُس فکر اور اُس ذہنیت کی بھی شکست ہے جو دنیوی بڑائی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ طالبان کی اِس فتح نے سیکولرازم کی سوچ پر ہتھوڑا مارا ہے اور اُس کی بنیاد کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ طالبان کی اِس فتح نے مادہ پرستانہ سوچ پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔

افغان طالبان کو بھی سمجھنا چاہیے کہ اُن کا کام ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا اصل امتحان اب شروع ہوا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنہیں یہ حوصلہ اور ہمت عطا فرمائے کہ وہ افغانستان کو مکمل طور پر ایک اسلامی فلاحی ریاست بنا کر باقی عالمِ اسلام پر حُجّت قائم کر دیں اور ہر مرحلہ پر طاغوتی قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہیں۔ آمین! ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت
اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

قرآن اور سُنّت کا باہمی تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا انجمن کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۸۴ء) کے موقع پر صدارتی خطاب

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہِ من الشَّیطٰنِ الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾﴾ (البیّنة)

﴿وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾﴾ (النّساء)

اس نشست میں ’’قرآن اور سُنّت رسول ﷺ کا باہمی تعلق‘‘ کے موضوع پر بہت مفصّل اور طویل خطاب پیشِ نظر نہیں ہے۔ آپ حضرات اس مسلّمہ حقیقت کو جانتے اور مانتے ہیں کہ قرآن اور سُنّتِ رسول ﷺ لازم وملزوم ہیں اور ان کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِس وقت مَیں سورۃ البیّنۃ کی ابتدائی چار آیات کی روشنی میں گفتگو کروں گا‘ جنہیں شاید ہی کبھی اس موضوع پر پیش کیا گیا ہو۔ میرے نزدیک یہی آیات اس موضوع کے ضمن میں اہم ترین ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾﴾ (البیّنة)

’’اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی وہ (اپنی اس گمراہی سے اور کفر سے) ہرگز باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس بیّنہ نہ آجاتی۔‘‘

یہاں ’’بیّنہ‘‘ کا لفظ بہت اہم ہے اور اسی سے اس سورۂ مبارکہ کا نام ماخوذ ہے۔ ’’بیّن‘‘ عربی زبان میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو اظہر من الشّمس ہو‘ اسے کسی خارجی و اضافی دلیل کی حاجت نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے ’’آفتاب آمد دلیلِ آفتاب‘‘ کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد وہ خود ہی اپنے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے‘ اگر کسی منطقی استدلال سے سورج کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کچھ شکوک وشبہات تو پیدا کر دیے جائیں گے‘ لیکن یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا‘ اس لیے کہ سورج خود اپنے وجود پر دلیلِ قاطع ہے۔ چنانچہ وہ چیز جو بالکل روشن ہو‘ ازخود واضح ہو اور اسے کسی خارجی سہارے اور استدلال کی ضرورت نہ ہو وہ ’’بیّن‘‘ ہے۔ ’’بَیِّنَۃ‘‘ اصل میں ہے کیا‘ اسے اگلی آیت میں define کیا گیا ہے:

﴿رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾﴾

’’ایک رسول جو اللہ کی طرف سے آیا ہے‘ جو پڑھتا ہے ایسے پاکیزہ صحیفے کہ جن میں بالکل راست اور درست تحریریں (اللہ کی کتابیں) درج ہیں۔‘‘

معلوم یہ ہوا کہ دونوں چیزیں مل کر ’’بَیِّنَہ‘‘ بنتی ہیں‘ ان میں سے کسی ایک کو ’’بَیِّنَہ‘‘ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رسول اور کتاب ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) ہیں اور یہ دونوں مل کر بَیِّنَہ بنتی ہیں۔ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔ غور کیجیے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو قرآن کہاں تھا! اُس وقت قرآن معجزے کے طور پر ابھی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ بَیِّنَہ ہونے کے اعتبار سے جو شے مقدّم ہے وہ رسول ﷺ کی ذات اور ان کی شخصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے جو پہلا خطاب کیا وہ یہ تھا کہ

”لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا......؟“ گویا رسول اپنی ذات میں سب سے پہلے خود دلیل ہے۔ یعنی بَیِّنَہ ہونے میں رسول کی ذات مقدّم ہے کتاب پر۔ کتاب کو تو بطورِ معجزہ تحدّی کے ساتھ‘ دلیل اور چیلنج کے انداز میں پہلی مرتبہ مکی دَور کے اواخر میں پیش کیا گیا۔ تین مکی سورتوں سورۂ بنی اسرائیل‘ سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اس قرآن کا جواب نہیں لا سکتے۔ سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں پوری کتاب کا ذکر کیا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۸۸﴾

”(اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں (اور پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اس قرآن جیسی کتاب پیش کریں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لا سکیں گے‘ چاہے وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔“

سورۂ ہود میں دس سورتوں کا ذکر ہے:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ ......﴾ (آیت ۱۳)

”کہہ دیجیے (اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ قرآن منزّل مِن اللہ نہیں ہے) تو اس جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ......“

اس کے بعد سورۂ یونس میں بر سبیل تنزل ایک سورۃ کا چیلنج دیا گیا کہ:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۳۸﴾

”(اے نبیﷺ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔“

پھر اسی چیلنج کو مدنی سورت‘ سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ دہرایا گیا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۲۳﴾

”اور اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے

پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورت تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اللہ کے سوا' اگر تم سچے ہو۔"

چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید بطورِ معجزہ مکی دَور کے اواخر میں پیش ہوا ہے' جبکہ نصف سے زائد قرآن نازل ہو چکا تھا۔ یہ بات بالکل عقلی اور منطقی ہے' اس لیے کہ ابھی جب چند آیات ہی اُتری تھیں تو اُن کو اس طور سے چیلنج کے انداز میں پیش کیا جانا غیر منطقی بات ہوتی۔ گویا بَیِّنَۃ ہونے کے اعتبار سے رسول ﷺ کی ذات خود قرآن مجید پر مقدم ہے۔

جہاں تک دین کے عملی پہلو کا تعلق ہے' اس ضمن میں بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے کسی کام کا آغاز پہلے کرا دیا گیا اور اس کے بعد کہیں جا کر اس کے بارے میں آیات نازل ہوئیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی مثال وضو کی ہے۔ وضو کا نظام مکہ کے اندر نافذ ہو چکا تھا۔ پنج گانہ نماز کا نظام ۱۱ نبوی میں آ چکا تھا' جبکہ مطلقاً نماز تو اس سے پہلے آ چکی تھی۔ کیا کوئی شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ تب وضو کا معاملہ نہ ہوگا؟ لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں وضو کا جو حکم نازل ہوا وہ سورۃ المائدۃ میں ہے' جو ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ تو کیا یہ پورا عرصہ یعنی سات برس مسلمانوں نے وضو کے بغیر نمازیں پڑھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ دین کے عملی پہلو کے اعتبار سے بھی رسولؐ مقدم ہے قرآن پر۔

وحی کے مختلف ذرائع

اس حقیقت کو ایک اور بات سے بھی سمجھ لیجیے' اس لیے کہ اس دَور میں بعض چیزیں جدید عقلیت پسندی (rationalism) کے زیر اثر ذہنوں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ آج شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ وحی کی بس ایک ہی شکل ہے جسے وحیٔ نبوت کہتے ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مختلف ذرائع (channels) بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں جو جبلی ہدایت (animal instinct) ہے اسے بھی وحی قرار دیا گیا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ......﴾ (النحل:۶۸) "اور تیرے ربّ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف"۔ یہاں حیوانات کی جبلی ہدایت کے لیے وحی کا لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ پھر بہت سے غیر نبی افراد کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں کہ اُن

پر وحی کی گئی۔ حضرت مریم (سلامٌ علیہا) کے بارے میں ہمارا اجماع ہے کہ وہ نبی نہیں تھیں' لیکن ان پر وحی ہوئی۔ ان کے بارے میں تو پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بہت اونچا مقام ہے' خود قرآن کی رو سے ''صِدِّیْقَة'' ہیں' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے بھی وحی کا لفظ آیا ہے: ﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی...﴾ (القصص:۷) ''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی ماں کی طرف......'' چنانچہ وحیٔ نبوت کا معاملہ تو بڑی چوٹی کی چیز ہے' اس سے کمتر درجے کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن پر لفظاً (literally) وحی کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ وحیٔ نبوت کے سوا تمام channels آج بھی کھلے ہیں' جیسے الہام ہو سکتا ہے' کشف ہے جو اولیاء اللہ کو ہوتا ہے' القاء ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دیتا ہے' اسی طرح سے رؤیاءِ صالحہ (سچے خواب) ہیں' جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوْا : وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: ((الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ))(۱)

''بشارتوں کے سوا نبوت کی کوئی چیز باقی نہیں رہی''۔ صحابہؓ نے پوچھا: بشارتوں سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سچا خواب۔''

صحیح مسلم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((اِنَّهٗ لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ يُرٰى لَهٗ))(۲)

''یقیناً مبشراتِ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں بچا سوائے سچے خواب کے جو مسلمان دیکھتا ہے یا اُس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

((اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ))(۳)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب المبشرات۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب النھی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزءً من النبوۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الرؤیا۔

”سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔“

کہیں آپؐ نے اس (سچے خواب) کو نبوت کا ساٹھواں حصہ بتایا ہے‘ جیسے مسلم کی ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں:

((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّۃِ)) (۴)

”سچے خواب نبوت کے ساٹھ حصوں میں سے ایک ہیں۔“

تو یہ سب چیزیں اب بھی جاری ہیں اور نبی ﷺ کے ساتھ بھی یہ تمام کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہے‘ نبی کا القاء بھی وحی ہے‘ نبی کا الہام بھی وحی ہے‘ نبی کو جو کچھ اللہ تعالیٰ دکھا دیتا ہے وہ بھی وحی ہے‘ اور نبی کو اللہ تعالیٰ جو بصیرت عطا فرماتا ہے وہ بھی وحی ہے۔ اس لیے کہ نبی جو آسمانی ہدایت وصول (receive) کرتا ہے اس کا کوئی ایک چینل نہیں ہے‘ بلکہ اس کے متعدد چینلز ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ ایک خواب تھا جو انہوں نے بیٹے کو ذبح کرنے کے ضمن میں دیکھا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۰۲)

”اے بیٹے! میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔“

یہ کتنا سنگین معاملہ ہے کہ قتلِ ناحق بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ (اکبر الکبائر) ہے۔ اگر نبی کو اپنے خواب کے بارے میں ذرا سا بھی اشتباہ ہوتا تو کیا اتنی بڑی جرأت کی جا سکتی تھی جب تک کہ وحی باللفظ (verbal revelation) کی صورت میں واضح ہدایات نہ آ جاتیں؟ اگر ذرا سا بھی اس میں کسی اشتباہ کا معاملہ ہوتا تو اس حکم پر عمل کرنا بہت غلط بات ہو جاتی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو جو خواب دکھایا گیا کہ عمرہ کر رہے ہیں تو آپؐ عمرہ کرنے کے لیے چل پڑے۔ آپؐ نے اس سلسلے میں سفر کیا اور پھر صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ

---

(۴) صحیح مسلم‘ کتاب الرؤیا۔

ساری چیزیں بھی ایک خواب کی بنیاد پر ہیں۔تو یہ تمام ذرائع ہیں جن سے نبی کو راہنمائی ملتی ہے۔ان میں سے خاص وہ جو وحی باللفظ ہے وہ قرآن میں محفوظ (recorded) ہے۔ باقی مختلف طریقوں سے جو رہنمائی اور علم آپؐ کو ملتا رہا ان سب کے بارے میں ایک نہایت جامع حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ))[۵] ''جان لو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس جیسی ہی ایک چیز اور بھی'' جو اس کے ہم وزن اور اس کے برابر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جو خاص بصیرت عطا فرمائی' آپؐ کو جو مشاہدات کرائے' آپؐ پر جو کچھ القاء فرمایا' جو الہام فرمایا' آپؐ کو خواب کے ذریعے جو ہدایات ملتی رہیں اور آپؐ کو جو بھی کشف ہوتا رہا' یہ تمام چیزیں نبی ﷺ کے لیے بھی قطعی ہیں جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ بھی درحقیقت وحی کا حصہ ہیں۔ البتہ یہ وحی متلو نہیں ہے' یہ وحی باللفظ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں وحی کے لیے دو اصطلاحیں مستعمل ہیں: وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو۔ وحیٔ متلو وہ ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے' یعنی قرآن۔ وحیٔ غیر متلو وہ ہے جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں انہیں وحیٔ جلی اور وحیٔ خفی کہتے ہیں۔ وحیٔ جلی جو بالکل واضح ہے وہ قرآن ہے' اور دوسری وحیٔ خفی ہے' اس کو ہم قرآن کے درجے میں نہیں رکھتے۔ البتہ وحی ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں' جیسا کہ شرکِ جلی اور شرکِ خفی کے بارے میں مَیں عرض کیا کرتا ہوں کہ شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک واضح ہے' سامنے دکھائی دینے والا شرک ہے کہ ایک شخص بُت کو سجدہ کررہا ہے جبکہ ایک ذرا اندر چھپا ہوا' ریاکاری والا شرک ہے کہ ایک انسان کسی کو خوش کرنے کے لیے نیک کام کررہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (مسند احمد) ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک

(۵) سنن ابی داؤد' کتاب السنۃ' باب فی لزوم السنۃ۔

کر چکا۔'' تو شرکِ خفی اور شرکِ جلی میں شرک ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں' دونوں شرک ہیں۔ البتہ ایک ظاہر و باہر شرک ہے اور ایک چھپا ہوا شرک ہے۔ اسی طرح وحیٔ خفی اور وحیٔ جلی کا معاملہ ہے۔

فتنہ انکارِ سُنّت کی بنیادیں

ہمارے ہاں انکارِ سُنّت کا فتنہ بڑا قدیم ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں جب بھی کوئی فتنہ اٹھتا ہے اس کی زد رسالت اور سُنّت پر پڑتی ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مسیلمہ کذاب کا نعرہ یہ تھا: كَفَانَا هِدَايَةُ الْقُرْآنِ ''ہمیں صرف قرآن کی ہدایت ہی کافی ہے''۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق ہے' جس کا ذکر سورۃ النساء میں بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ (آیت ۱۵۰) یعنی کچھ لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں۔

سورۃ النساء کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پر جو چیزیں شاق گزرتی تھیں وہ تین تھیں: (۱) رسول اللہ ﷺ کی اطاعت' جو شخصی اطاعت بن جاتی ہے۔ قرآن تو ایک ادارہ (institution) ہے' جس میں اپنے جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے سامنے سر جھکانا نہیں پڑتا جبکہ محمد ﷺ کا اللہ کا رسول ہونا ایک مخفی بات ہے' جو عالمِ غیب سے متعلق ایک شے ہے۔ آپؐ نظر تو سب کو یہی آتے تھے کہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ چنانچہ اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا کہ جو آپؐ حکم دیں گے وہ مانوں گا' یہی ان کے لیے سب سے زیادہ شاق گزرنے والی بات تھی۔ (۲) قتال فی سبیل اللہ' (۳) ہجرت ـــــ یہ تین چیزیں تھیں جن کا سورۃ النساء میں تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور منافقین کے لیے سب سے کٹھن یہی مراحل تھے۔ بعد میں جب بھی فتنہ اٹھا' اسی بنیاد پر اُٹھا۔ خوارج کا بھی یہی نعرہ تھا: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' یعنی ہمیں صرف کتاب اللہ چاہیے اس کے سوا کچھ نہیں چاہیے' ہم تو صرف اسی کی پیروی کریں گے۔ یہ ہماری اُمّت کی تاریخ میں عظیم ترین فتنہ تھا۔ پھر اس کے بعد بھی ہماری تاریخ میں اسی بنیاد پر فتنے اٹھتے رہے ہیں۔

برعظیم پاک و ہند میں انکارِ سُنّت کا جو فتنہ اٹھا دراصل اس کی جڑ میں مشرق اور مغرب کی دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ ایک ہماری اپنی پرانی تہذیب ہے‘ اس کی اپنی روایات ہیں‘اس کے کچھ شعائر ہیں‘ اس کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو متفق علیہ ہیں۔ جب انگریز ہمارے ہاں آیا‘ اس نے ہمیں فتح کیا اور ہم پر حکمران ہوا تو وہ ایک نئی تہذیب لے کر آیا۔ چنانچہ دو تہذیبوں کا تصادم شروع ہوا اور ہمارے ہاں ابتدا ہی میں دو رائیں بن گئیں۔ ایک رائے کے سب سے بڑے قائل اور اس کو پیش کرنے والے سرسید احمد خان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں سے خلوص و اخلاص کی بنا پر ان کی بہتری کے لیے یہ رائے سامنے رکھی کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم انگریزی پڑھیں‘ انگریزی علوم سیکھیں‘ انگریزی تہذیب اختیار کریں اور انگریزوں کے قریب ہو جائیں‘ بلکہ ان کے الفاظ یہاں تک نقل کیے گئے ہیں کہ ہمیں صرف چمڑی کی رنگت کے سوا (کیونکہ اس پر تو ہمارا قابو اور اختیار نہیں) ہر چیز میں انگریز ہو جانا چاہیے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ ان کے سامنے قومی مسابقت تھی کہ ہندو تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر ہندو نے آگے بڑھ کر انگریز کے ساتھ اپنا معاملہ کر لیا تو مسلمان یہاں اچھوت بن کر رہ جائیں گے اور ان کا کوئی دنیاوی و سیاسی مستقبل نہ رہے گا۔ وہ چونکہ بنیادی طور پر قومی رہنما تھے اس لیے انہوں نے یہ تجزیہ پیش کیا۔ دوسری طرف علمائے کرام تھے جن کا اپنا ایک طرزِ عمل تھا اور وہ اس پر اَڑ گئے کہ ہم قَالَ اللّٰہُ اور قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کے دامن سے وابستہ رہیں گے۔ ہم اپنے آپ کو اپنی روایات‘ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کے ساتھ باندھے رکھیں گے۔ دنیا بگڑتی ہے تو بگڑے‘ ہم کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ مسلمان اس نئی تہذیب میں بہ نہ جائیں۔ یہاں سے وہ تصادم شروع ہوا۔

ایک غالب تہذیب تھی جو حکمرانوں کی تھی۔ حکمرانوں سے مرعوبیت ویسے ہی ہوتی ہے‘ لہٰذا لوگ اس نئی تہذیب کی طرف لپکے۔ پھر کچھ لوگوں نے دیکھا کہ اس سارے معاملے میں جو رکاوٹ بنتی ہے وہ ہے سُنّتِ رسولؐ اور حدیثِ رسولؐ۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن مجید کی تو ہم کچھ نہ کچھ تأویل کر لیں گے‘ اس کے کچھ نہ کچھ معنی نئے سے نئے نکال

لیں گے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا گیا کہ: ﴿اِضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ﴾ (الشُّعراء: ۶۳) ''مارو اپنا عصا سمندر پر۔'' اب ''ضَرَبَ'' کے مختلف معنی ہیں۔ اس کا معنی زمین میں چلنا پھرنا بھی ہوتا ہے اور مارنا بھی۔ اس معجزہ کے بارے میں جدید سائنسی عقلیت پسندی کے دور میں ہم لوگوں سے یہ کیسے کہیں کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سمندر پر پڑا اور وہ پھٹ گیا؟ لہٰذا اس کی کوئی تاویل کی جائے' کوئی ایسا ترجمہ کیا جائے جو سائنس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اسی طرح جِنّات کے بارے میں ہم یہ کیسے کہہ دیں کہ ان کا بھی کوئی وجود ہے' وہ غیر مرئی (invisible) ہیں اور آگ سے بنے ہیں؟ ان کے نزدیک یہ بڑی مشکل بات تھی کہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ باتیں کہیں۔ لہٰذا ان کی ایسی تاویلات کی گئیں جو جدید مغرب زدہ اذہان کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ حدیث کا معاملہ یہ تھا کہ اس سے ہماری تہذیبی روایات بنی تھیں اور اسی نے ہمیں زندگی کا نقشہ دیا تھا' لیکن اُس وقت یہ کہہ دیا گیا کہ اس کی زیادہ ضرورت نہیں' ہمیں تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

یہ فکر ہمارے ہاں رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ البتہ اُس وقت دو چیزیں ایسی تھیں جن کی بنا پر یہ فکر زیادہ نہیں پھیلا' صرف ہمارے ہاں ایک اونچا طبقہ تھا جس تک یہ محدود رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابھی مغربی تہذیب وتمدن سے ہمارا براہِ راست رابطہ بہت کم تھا۔ لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں سے جو آئے ہوئے تھے وہ ہمارے حکمران تھے' جو غاصب تھے اور ہم ان کے محکوم تھے' لہٰذا فطری طور پر عوام کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کم ہی لوگ تھے جنہوں نے اس تہذیب کو اپنایا جبکہ عوام کی اکثریت اپنی تہذیب اور روایات پر قائم رہی۔

تہذیبوں کا یہ تصادم سب سے پہلے شدید ترین صورت میں ترکی میں سامنے آیا' اس لیے کہ وہ دراصل مشرق اور مغرب کے مابین پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ خالدہ ادیب خانم کے زمانے سے جو مضامین لکھے گئے اور اتاترک نے جس طرح کا معاملہ کیا' یہ تہذیبِ مغرب کی بالادستی تھی۔ پھر بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ واقع عرب ممالک شام' فلسطین'

مصر اور مراکو اس کی زد میں آئے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ بحیرۂ روم ایک جھیل کی مانند ہے۔ اس کے ایک طرف یورپ اور دوسری طرف یہ سارے مسلم ممالک ہیں۔ ان کی مغرب میں آمد و رفت چونکہ بہت تھی لہٰذا مغربی تہذیب کا اثر ان پر سب سے پہلے اور بہت زیادہ ہوا۔ ہمارے ہاں تو سات سمندر کا فاصلہ شمار ہوتا تھا‘ شاذ ہی لوگ وہاں جاتے تھے۔ زیادہ تر تو پڑھنے ہی جاتے تھے‘ اور جو وہاں سے واپس آتا تو اس کے بارے میں مشہور ہو جاتا کہ ’’کرسٹان‘‘ ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کا اتنا زیادہ رابطہ نہیں تھا۔ چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو آ کر ہم پر حکمرانی کر رہے تھے‘ اس لیے ان کے ساتھ نفرت کا معاملہ بھی تھا۔

متذکرہ بالا دونوں عوامل (factors) تقسیم ہند کے قریب آ کر اور آزادی کے بعد ختم ہو گئے‘ لہٰذا بند کھل گیا۔ اب ایک طرف تو لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بے پناہ ہے۔ ہماری نوجوان نسل کا ایک بڑا حصہ جو وہاں جاتا ہے وہاں سے متأثر ہو کر آتا ہے۔ ان کے رنگ میں رنگ کر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انگریز کے جانے کے بعد اس کی جگہ اب وہ دیسی انگریز حکمران ہیں جو سرسید کے قول کے مطابق صرف چمڑی کے دیسی ہیں‘ باقی اپنی تہذیب‘ اپنی تربیت‘ اپنی شخصیت اور ذہنیت کے اعتبار سے بالکل یورپین ہیں۔ اب وہی ہماری ملٹری کے اعلیٰ عہدیداران ہیں‘ وہی ہماری سول بیوروکریسی کے سب سے اونچے ستون ہیں‘ لہٰذا یہاں مغربی تہذیب کی بالادستی کا معاملہ بہت تیزی کے ساتھ ہوا ہے۔ ہمارے ہاں اِس وقت جو مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں ان کی بنیاد میں وہی تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔ دیت کا مسئلہ ہو‘ شہادت کا مسئلہ ہو یا ستر و حجاب کا مسئلہ ہو‘ ان کی بنیاد میں وہی نظریۂ مساواتِ مَرد و زن ہے جو یورپ سے آیا ہے۔ یہ وہی دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے جو آپ کو اب نظر آ رہا ہے۔ مَیں نے تو ایک خط بھی پڑھا تھا جو ’’پاکستان ٹائمز‘‘ میں شائع ہوا تھا‘ جس میں مکتوب نگار نے یہاں تک لکھ دیا کہ قرآن کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعتاً عورتوں کو ثانوی پوزیشن الاٹ کرتا ہے‘ لہٰذا ہمیں اجتہاد کا کوئی ایسا اصول اپنانا ہو گا جو قرآن سے بھی اوپر چلا جائے۔ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ بھی کہنے والے موجود ہیں۔ پھر ہمارے ایک بڑے عالمِ دین کا یہ بیان بھی اخبارات میں آ گیا کہ نصوص کے اندر

بھی اجتہاد ہو سکتا ہے‘ حالانکہ وہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے آدمی ہیں۔ یہ ساری چیزیں آپ گنتے جایئے۔ درحقیقت یہ وہی ’’دو تہذیبی ٹکراؤ اور تصادم‘‘ ہے۔ اس میں جو چیز بھی جہاں پر بھی رکاوٹ بنتی نظر آتی ہے‘ کہیں اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز قرآن میں نہیں ہے‘ اور سُنّت کی اہمیت ثانوی نظر آئے گی۔ کہیں اس سے بھی آگے چل کر یہ کہا جائے گا کہ کوئی حدیث معیار پر پوری نہیں اتر رہی۔

اسلامی قوانین کے مآخذ

اصولی بات یہ ہے کہ جہاں ہمارے قانون کا اوّلین منبع اور ماخذ (source) قرآن مجید ہے وہاں اس کا دوسرا ماخذ سُنّتِ رسولؐ ہے جو اپنے طور پر خود مختار (independent) ہے۔ تیسرے نمبر پر خود رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق‘ سُنّتِ خلفاء راشدین مہدیین ہے۔

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری تاریخ کُل کی کُل تاریک نہیں ہے۔ یہ بہت روشن رہی ہے۔ پچھلی تین چار صدیاں اگر تاریکی میں گزری ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم شرم اور خجالت سے اپنے سر جھکا لیں کہ شاید ہماری پوری تاریخ بالکل تاریک ہے۔ قرآن اور سُنّتِ رسولؐ نے جو روشنی دی تھی‘ خلافتِ راشدہ کا ایک عظیم نظام اُس پر چلا۔ اس کے بعد دورِ اُموی اور دورِ بنوعباس میں یہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح پر دستوری نظام بدل گیا‘ لیکن تہذیبی روایات کا ارتقا اور ان کا تسلسل جاری رہا۔ ان اَدوار میں ہمارے جو ائمہ ٔ دین اور محدثین گزرے ہیں ان میں سے ایک ایک چاند ستاروں کی مانند ہے۔ ہماری تاریخ کے ان افراد کی خدمات‘ ان کا علمی مقام و مرتبہ اور اس پر مستزاد اِن کا تدیّن‘ تقویٰ‘ احتیاط اور للّٰہیت کا جو معیار ہمیں ملتا ہے‘ ہماری تاریخ ان چیزوں سے بنی ہے۔

سُنّتِ خلفاءِ راشدین کے بعد اہلِ سُنّت کے چاروں ائمہ کا اگر کسی بات پر اجماع ہو گیا‘ وہ کسی چیز پر متفق ہو گئے تو یہ خود اپنی جگہ پر ایک دلیل ہے۔ درحقیقت دلیل یہ نہیں ہے کہ یہ ائمہ ٔ اربعہ کا موقف ہے‘ بلکہ یہ درحقیقت اُس تعامل کا مظہر ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ دورِ نبوت میں جو کچھ روایات بنی تھیں یہ درحقیقت اسی کا مظہر ہے۔ کیا ہم امام ابوحنیفہ‘ امام شافعی‘ امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ

اپنے پاس سے کوئی چیز گھڑ کر لائے ہوں گے؟ کیا ہم ان کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں؟ معلوم یہ ہوا کہ اگر ائمۂ اربعہ کا کسی بات پر اجماع ہے تو وہ بے دلیل نہیں ہے‘ خواہ اس کے بارے میں کوئی نص پیش نہ کی جا سکے۔

ایک بات بڑی سادہ سی ہے۔ بسا اوقات ایک سچی حقیقت بھی عدالت میں جا کر ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ سچی حقیقت جھوٹی ہوگئی۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ: لوگو! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قطعہ زمین کے متعلق تم میں سے دو افراد کا جھگڑا ہوتا ہے اور وہ میرے پاس آتے ہیں‘ ان میں سے ایک زیادہ چرب زبان ہے اور وہ اپنی بات کو ثابت کر دیتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں‘ لیکن جان لو کہ اگر کوئی مجھ سے غلط فیصلہ لے گیا تو وہ آگ کا ٹکڑا لے کر گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کا صحیح ہونا اور ہے جبکہ اس کا ثابت ہو جانا اور ہے۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قاضی شریحؒ نے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو جھوٹا کہا گیا؟ قاضی کا موقف یہ تھا کہ جناب آپ کا دعویٰ بالکل سچا ہوگا مگر میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے دو گواہ چاہئیں اور گواہی میں بیٹا اور غلام پیش نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اگرچہ حضرت علیؓ کے گواہ آپ کے بیٹے حضرت حسنؓ اور آپؓ کے غلام تھے‘ لیکن ان کی گواہی قبول نہ کی گئی اور زرہ یہودی کو دے دی گئی کہ اس پر آپؓ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوا۔ اس پر وہ یہودی ایمان لے آیا اور زرہ بھی واپس کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ صحیح تھا۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ ہر صحیح بات ثابت بھی ہو جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حدیث امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہ اترے‘ لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ حدیث غلط ہے اور موضوع ہے۔ ایسے بہت سے موتی ہو سکتے ہیں جو ہمارے پاس اُن احادیث میں موجود ہوں جو ان بڑے بڑے ائمہ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور انہوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر ہمارے معاشرے میں دورِ خلافتِ راشدہ میں کسی بات پر عمل ہوا تو یقیناً وہ بات صرف ایک حدیث کے بل پر نہیں تھی‘ دوسرے بہت سے عوامل ہوں گے جن کی وجہ

سے دورِ خلافت راشدہ میں اس پر عمل ہوا۔ چنانچہ اگر ائمۂ اربعہ اس کے بعد کسی بات پر متفق ہو رہے ہیں تو یقیناً وہ کسی دلیل پر متفق ہوئے ہوں گے‘ خواہ کوئی حدیثِ صحیح اس سلسلے میں پیش نہ کی جا سکے۔ اس لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ائمۂ اربعہ کا اجماع از خود ایک دلیل بن جاتا ہے۔ آپ حضرات اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

ہمارے ہاں دیت اور قانونِ شہادت وغیرہ پر جو بحثیں چھڑ گئی ہیں‘ اس ضمن میں میرا اپنا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اصل میں دو چیزیں بالکل جدا ہیں‘ انہیں آپس میں گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ کسی انسان میں انفرادی طور پر یا کسی قوم میں اجتماعی سطح پر ایک ارادہ (will) پیدا ہو جانا کہ ہمیں مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ دوسرے‘ اس کو یہ بتانا کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ان دونوں کو گڈ مڈ نہ کیجیے۔ جب تک وہ ارادہ ہی نہیں ہے تو ان بحثوں میں پڑنے کا فائدہ؟ ایک آدمی کے اندر ابھی وہ ارادہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ وہ اللہ کے حکموں پر چلے اور آپ اسے اللہ کا حکم بتا رہے ہیں۔ ابھی اس کے دل میں وہ جذبہ ہی نہیں اُبھرا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سُنّت کا اتباع کرے اور آپ اسے سُنّتِ رسولؐ پر لیکچر دے رہے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے اجتماعی اور قومی سطح پر وہ ارادہ پیدا کریں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا‘ یہ بحثیں چھیڑ دینا بالکل بے کار ہے۔ اس سے لوگوں میں کنفیوژن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ انقلابی طریقہ کار کے ذریعے سے پہلے ارادہ پیدا کرنا ہوگا‘ اور وہ ہوگا قرآن کی حکمت اور فلسفے سے‘ قرآن کی ہدایت اور روشنی کو عام کرنے سے۔ پھر اس ارادے کا انقلابی انداز میں ظہور ہوگا اور وہ اپنے آپ کو ثابت کرے گا کہ اس ملک میں رہنے والوں کے اندر اب یہ عزم پیدا ہو چکا ہے کہ وہ مسلمان جینا چاہتے ہیں اور مسلمان مرنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ سارے معاملات کھلتے چلے جائیں گے۔

اصلاحی صاحب کے موقف سے اعلانِ براءت

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ میرا ایک تعلق بہت طویل عرصے تک رہا ہے کہ میں ہی ان کا spokesman اور پبلشر رہا ہوں۔ میں نے ان کا پرچہ (میثاق) بھی شائع کیا اور تفسیر تدبّر قرآن بھی‘ پھر لاہور میں اجتماعات بھی منعقد کروائے۔ اس کے بعد

اب ان کی طرف سے حدِّ رجم کے بارے میں جو موقف سامنے آیا ہے تو اس سے اسی زور شور سے اعلانِ براءت بھی کرنا ضروری ہے۔ ان کے فکر میں پہلے بھی بعض چیزیں ایسی آتی رہی تھیں کہ جن پر ہم چونکتے رہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر کرتے ہوئے معراج کو انہوں نے کچھ دبے لفظوں میں خواب کی شکل میں پیش کیا کہ یہ ایک ''رؤیا'' تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے کہا کہ یہ موقف درست نہیں ہے' لیکن اس کا معاملہ ہمارے عقائد کے ساتھ ہے' عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اقوال ہمیں اسلاف میں بھی مل جاتے ہیں' جس طرح کہ رؤیتِ باری تعالیٰ میں اختلاف ہے کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں! یہ اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے چلا آ رہا ہے۔ ایک طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نہیں دیکھا' دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھا ہے۔ تو اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص کوئی بات کہے' لیکن دین کے عملی پہلو کا معاملہ بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں اہلِ ایمان کے راستے سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ نکالا جائے گا تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اس کے بارے میں مَیں نے آغاز میں آیت پیش کی ہے:

﴿وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۝۱۱۵﴾ (النّساء)

''اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی اس کے بعد کہ اُس پر کھل چکی سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستے کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اُس کو اسی طرف جو اُس نے اختیار کی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں' اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

اہلِ ایمان کا راستہ قرآن' سُنّتِ رسول ﷺ' سُنّتِ خلفائے راشدین مہدیّین اور اس کے بعد ائمۂ اربعہ کے اجماع سے بنا ہے۔ اہلِ سُنّت کا راستہ متذکرہ بالا مراحل سے ہو کر گزرا ہے اور وہ ایک شاہراہ ہے۔ اس کے لیے تو یوں کہا جائے گا: ''لَيۡلُهَا كَنَهَارِهَا'' یعنی اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ اب اس راستے سے ہٹ کر جو بات کہی جائے گی اس

سے اعلانِ براءت پوری شدت کے ساتھ کرنا ہوگا۔

رجم کے معاملے میں مولانا اصلاحی نے جو رائے ظاہر کی اس سے پہلے کا بھی ایک واقعہ بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا کی تفسیر کی دوسری جلد ابھی صرف ''میثاق'' میں چھپی تھی' کتابی شکل میں نہیں آئی تھی کہ سورۃ النساء کی ایک آیت کی تاویل جو مولانا نے کی' اس پر بعض علماء کا اعتراض آیا۔ ان میں ایک ساہیوال کے مولانا برکات احمد خاں صاحب تھے' جو کوئی معروف عالم دین نہیں تھے۔ مَیں نے مولانا اصلاحی صاحب سے عرض کیا کہ ابھی یہ کتابی شکل میں نہیں چھپی' اس پر آپ نظر ثانی کر لیجیے۔ مولانا نے فرمایا کہ اب مَیں ہر شخص کی بات پر توغور نہیں کر سکتا' کوئی بڑا عالم دین اگر بات کرے گا تو جواب دوں گا۔ یہ معاملہ اصل میں سورۃ النساء کی آیت ۳ سے متعلق تھا: ﴿وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ ''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر نکاح کر لو دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں' دو دو تین تین اور چار چار سے۔'' اس آیت کے بارے میں اجماعی نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تم یتیم بچیوں سے نکاح کر کے اگر یہ سمجھتے ہو کہ ان کی طرف سے بولنے والا کوئی نہیں' ان کا کوئی بھائی یا باپ اُن کے حقوق کی نگہداشت کرنے والا موجود نہیں کہ ان کے حقوق اگر تلف کیے جا رہے ہوں تو کوئی ان کی طرف سے کھڑا ہو' تو پھر یتیم بچیوں سے نکاح نہ کرو بلکہ جو دوسری عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو' تین تین' چار چار تک شادیاں کر لو۔ لیکن مولانا نے رائے ظاہر کی کہ یہاں ''اُمّہات الیتٰمی'' مراد ہیں' یعنی یتیموں کی ماؤں سے شادیاں کر لو۔ یہ بات اجماع کے خلاف تھی۔

اُن دنوں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ کافی روابط تھے اور ''مجلس دعوت و اصلاح'' میں یہ حضرات شریک تھے۔ میں نے جب مفتی صاحبؒ سے یہ معاملہ عرض کیا تو انہوں نے کہا یہ تو واقعتاً بڑی گمراہی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی یہ بات کتابی شکل میں نہیں چھپی' اور اگر آپ مولانا کو قائل کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے گا اور ابھی سے غلطی کی اصلاح ہو جائے گی۔ میرے بہت کہنے کے باوجود انہوں نے مولانا سے

کوئی خط و کتابت نہیں کی تو میں اپنی جگہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا اور میں نے دوسری جلد شائع کر دی۔ وہ مسئلہ بھی خیر اتنا بڑا نہیں تھا۔ اصل میں اس کے ساتھ ہی مولانا نے یہ لکھ دیا تھا کہ جہاں تک تعدّدِ ازدواج (polygamy) کا تعلق ہے وہ ثابت ہے' اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں۔

اب یہ جو حدّ رجم کا مسئلہ سامنے آیا ہے یہ یقیناً ایسی بات ہے جس میں ہماری اُمّت میں سے سوائے خوارج کے آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ شیعہ' سُنّی اور اہلِ ظاہر سب اس پر متفق ہیں۔ اہلِ سُنّت کے چاروں امام' شیعوں میں زیدیہ ہوں یا جعفریہ سب کے سب' اہلِ حدیث علماء' اہلِ ظاہر میں امام داؤد ظاہری' ان سب کا اجماع ہے کہ اسلام میں شادی شدہ زانی مرد اور شادی شدہ زانیہ عورت کے لیے حدّ رجم کی سزا ہے۔ جب مولانا اصلاحی نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی اور ایک جلیل القدر صحابی کو جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے وہ توبہ کی ہے جو سارے مدینہ والوں پر تقسیم کر دی جائے تو ان کے لیے کافی ہو جائے گی (معاذ اللہ!) ''غنڈہ'' لکھا تو اب یہ بات ایسی تھی کہ جس سے شدّت کے ساتھ اعلانِ براءت کرنا مجھ پر لازم تھا۔ اس لیے کہ مَیں ہی اس کا پبلشر ہوں' اس تفسیر کو مَیں نے چھاپا ہے۔ یقیناً مولانا کا مقام اپنا ہے لیکن اس کو چھاپ کر متعارف کرانے میں میرا بھی حصّہ ہے' لہٰذا میں نے اس سے اعلانِ براءت کیا اور کہا کہ مَیں کم از کم اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کو اب منکرینِ سُنّت کی صف میں سمجھتا ہوں۔ یہ ایک مجمع علیہ شے ہے اور اس سے ہٹ جانا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے۔

پھر اصلاحی صاحب کے حلقے کے ایک نوجوان نے اس سے بھی آگے بڑھ کر چھلانگ لگانی شروع کی اور ایک غامدیہ خاتون جن کو رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا تھا' ان کے بارے میں کہنا شروع کیا کہ وہ چکلہ چلاتی تھیں۔ وہ خاتون تین دفعہ آپؐ کے پاس چل کر آئی کہ مجھے پاک کر دیجیے' جسے آنحضور ﷺ نے واپس لوٹا دیا۔ اس سے دریافت کیا کہ: کہیں تمہیں حمل تو نہیں؟ اس نے کہا حمل تو ہے! فرمایا: جاؤ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے' جرم ہے تو تمہارا ہے' لہٰذا وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ اللہ کی بندی پھر چلی آتی ہے کہ مجھے پاک

کر دیجیے‘ مَیں آخرت کی سزا نہیں جھیلنا چاہتی‘ مجھے یہاں پر بڑی سے بڑی سزا منظور ہے۔ خطا کس سے نہیں ہو جاتی؟ لیکن خطا کے بعد توبہ کا یہ معاملہ کہ اللہ کی ایک بندی رجم کی سزا جھیلنے کو تیار ہے‘ اس کے بارے میں اِس قسم کے الفاظ کہے جائیں!

ایک نئے فتنے کا آغاز

جہاں تک اصلاحی صاحب کا معاملہ ہے‘ میں ان کے لیے فتنے کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ میں نے اس معاملے میں فقط اتنا کہا ہے کہ وہ منکرینِ سُنّت کی صف میں آ گئے ہیں‘ لیکن جس نوجوان کا آغاز یہاں سے ہو رہا ہے وہ یقیناً ایک فتنہ اٹھا رہا ہے۔☆ اصلاحی صاحب تو عمر کے آخری دَور میں ہیں‘ ان کی خدمات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ ایک معاملے میں ان سے بہت بڑی لغزش ہوئی‘ اس سے ہم نے اعلانِ براءت کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی پوری زندگی میں کوئی ایسی بڑی چیز نظر نہیں آتی۔ صرف یہی چند چیزیں ہیں جو میں نے عرض کر دیں۔ لیکن ایک ایسی شے جو ائمۂ اربعہ کی مجمع علیہ ہے‘ خلفائے اربعہ کی مجمع علیہ ہے‘ جس کے بارے میں بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ موجود ہیں‘ اس سے روگردانی کرنا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے‘ اور میرے سابقہ تعلق کی وجہ سے میرے ذمّے یہ فرض تھا کہ اس معاملے میں اپنا موقف کھل کر سامنے رکھ دوں۔ ان کے شاگرد کا جو مسئلہ ہے اس کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ میں اسے فتنہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ایک نوجوان یہ کہے کہ ’’کلالہ‘‘ کے معنی آج تک کسی نے نہیں سمجھے‘ صرف میں نے سمجھے ہیں اور اس کے گرد کچھ ایسے نوجوان بھی جمع ہو جائیں جو یہ مان لیں کہ ہاں اسی نے سمجھے ہیں اور وہ برملا کہے کہ ہم ایک نئی شریعت کی ترتیب کرنے والے ہیں‘ اس کے فتنہ ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

ایک بات جان لیجیے کہ دنیا میں جتنے بھی فتنے اٹھے‘ اسی طرح اٹھے۔ عام آدمی تو کوئی فتنہ نہیں اٹھایا کرتا۔ ایسا تو کوئی باصلاحیت آدمی ہی کرتا ہے۔ غلام احمد قادیانی نے بھی پہلے

☆ واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ خطاب سینتیس (۳۷) سال پہلے کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں جس نوجوان کا ذکر کیا ہے یہ صاحب علامہ جاوید احمد غامدی کے نام سے معروف ہوئے اور ان کا اٹھایا ہوا فتنہ اس وقت پورے عروج پر ہے۔ (مرتّب)

دین کی بڑی خدمت کی تھی جس کی وجہ سے اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اُس نے مناظروں میں عیسائیوں کو شکستیں دی تھیں‘ آریہ سماجیوں کو شکستیں دی تھیں تب جا کر لوگ اس کے گرویدہ ہوئے۔ اس کے بعد اُس نے ایک ایک کر کے چیزیں ان کے حلق سے اتروانی شروع کر دیں۔ تو جس کو بھی کسی نئے فتنے کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ تنبہ عطا فرمائے اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اس بارے میں خبردار کرے۔

اصل میں علماء کو بحیثیتِ مجموعی قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں سے جو اندیشے لاحق ہیں اور ان کے بارے میں ان کا جو ایک allergic attitude ہے اس کا سبب ہی یہی ہے۔ مجھے تو اب علماء کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو رہی ہے کہ جب بھی انہوں نے سنا کہ کوئی شخص قرآن کا نام لے کر اٹھ رہا ہے تو ایک دم ان کے کان کھڑے ہوئے کہ کہیں کوئی اور نئی مصیبت تو نہیں آنے والی! کہیں کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھنے والا؟ اس کی وجہ یہی ہے۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی نے بھی اپنے کام کا آغاز قرآن ہی سے کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو: ؎

اے بے خبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند!

اور: ع

قمر ہے چاند اوروں کا‘ ہمارا چاند قرآں ہے!

یہ سب کچھ اُس نے کہا۔ پھر دیکھئے سر سید احمد خان کا اوڑھنا بچھونا قرآن تھا۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر لکھی جس میں ساری گمراہیاں پھیلائیں۔ اہلِ قرآن اور منکرینِ سُنّت تو معلوم ہوتا ہے قرآن کے ٹھیکیدار ہیں۔

چونکہ قرآن کے نام پر فتنے اٹھتے رہے ہیں لہٰذا ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لوگ آثارِ قدیمہ کو کروڑوں روپیہ صَرف کر کے محفوظ (preserve) کرتے ہیں‘ تو ہمارے لیے دین کے آثار صحابہ کرامؓ اور ائمۂ دین کی آراء ہیں۔ یہ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں اور ان کو بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔ ((عَضُّوْا عَلَيْهَا

بِالنَّوَاجِذِ)) کے مصداق اگر ہم ان کو دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامیں گے تبھی اس دور کے فتنوں سے بچیں گے۔ ورنہ ایک سے ایک نیا فتنہ آتا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ لوگوں کو دین کی طرف سے برگشتہ کر کے انہیں اصل راستے سے ہٹا کر غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ ایسے فتنے اٹھانے والوں میں کچھ نہ کچھ تو ذہانت و فطانت اور صلاحیت ہوتی ہے جو لوگوں کو اصل راستے سے ہٹا کر لے جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی الوداعی وصیت

اب ہم ایک حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں:

عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ ثُمَّ وَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَ وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ قَائِلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ:((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَ اِنْ كَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا، فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))... وَفِيْ رِوَايَةٍ: ((وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ))(٦)

’’حضرت عرباض بن ساریہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد ہمیں ایسا پُراثر وعظ فرمایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور ہمارے دل اس سے لرز گئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ تو ایسے لگتا ہے کہ آپؐ نے کوئی الوداعی وعظ فرمایا ہے (یعنی اس انداز سے جیسے آپؐ ہم سے وداع ہو رہے ہیں یا ہمیں وداع کر رہے ہیں) تو ہمیں نصیحت کیجیے! (یعنی اگر یہ علیحدگی کا وقت ہے اور الوداعی خطاب کا

---

(٦) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ وسنن الدارمی، المقدمة، باب اتباع السنة۔ الفاظ کم وبیش سنن دارمی کے ہیں۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السُنّة، باب فی لزوم السُنّة۔

انداز ہے تو ہمیں وہ اصول دے دیجیے کہ جنہیں ہم تھام لیں) آپ ﷺ نے فرمایا: ''(سب سے پہلے تو) مَیں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی' وہ جو العزیز ہے اور بہت جلالتِ شان والا ہے۔ اور (دوسری نصیحت ہے) سننے اور ماننے کی (یعنی اجتماعی نظم وضبط) اگرچہ ایک حبشی غلام تمہارا امیر بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تمہارے لیے میری سُنّت اور ہدایت یافتہ راست رَو خلفاء کی سُنّت کی پیروی لازم ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ (یہ محاورہ ہے' یعنی کسی کو شدت اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینا) اور دیکھنا (دین میں) نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچتے رہنا' اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے' اور ہر بدعت گمراہی ہے''......اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''اور ہر گمراہی آگ میں جھونکی جانے کے قابل ہے۔''

اب میں دو چیزوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ خلفائے راشدین سے کیا مراد ہے! عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین یہی خلفائے اربعہ ہیں' یعنی حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی جو شرح کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے کہ یہاں دونوں خلافتیں مراد ہیں' خلافتِ علمی اور وہ خلافت جو حکومت کی سطح پر قائم ہوئی۔ اس لیے کہ یہاں الفاظ استعمال ہو رہے ہیں: ((سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) اور خلافتِ راشدہ کا جو نظام بعد میں سیاسی طور پر قائم ہوا وہ نظام تو اُس وقت پردۂ غیب میں تھا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ میرے خلفاء یا میرے بعد آنے والے وہ لوگ جو راشد ہوں' مہدی ہوں' رشد و ہدایت پر ہوں' ہدایت یافتہ ہوں۔ ان میں یقیناً چاروں خلفاء بھی شامل ہیں جو ہمارے خلفائے راشدین ہیں' ان پر تو اہلِ سُنّت کا اجماع ہو گیا' اس لیے کہ یہی وہ چار ہیں جن میں اختلاف کی کوئی بات نہیں ہوئی' لیکن اس کے بعد کا معاملہ سیاسی اعتبار سے مختلف فیہ ہے۔ بعد میں آنے والوں میں جو لوگ علمِ نبوت کے وارث بنے' یعنی علماء' ائمۂ دین' فقہاء اور محدّثین' یہ بھی یقیناً محمد رسول اللہ ﷺ کے خلفاء میں سے ہیں۔ یہ خلافتِ علمیہ ہے۔ پھر خلافتِ

باطنیہ ہے۔ خلافتِ ظاہری وہ ہے جس پر حکومت کا نظام ہمارے ہاں چلا ہے‘البتہ ’’خلافتِ راشدہ‘‘ میں یہ تینوں ایک وحدت ہیں۔ باطنی خلافت‘ علمی خلافت اور سیاسی خلافت یہ تینوں جمع ہوگئی ہیں حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر‘ حضرت عثمان اور حضرت علی ﷡ کی ذات میں۔ لیکن بعد میں پھر تقسیم ہوتی چلی گئی۔ ایک خلافت سیاسی رہ گئی‘ ایک خلافت علمی اور ایک خلافت باطنی۔ اس کے علاوہ روحانی خلافتوں کا جو سلسلہ ہمارے ہاں بیعت کی بنیاد پر چلا ہے اور جو ہماری ساری روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی درحقیقت اس ڈگر سے ہٹ کر نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بدعت محض کسی رسم کا نام نہیں۔ دین میں نیا خیال ظاہر کرنا اور بالکل مجمع علیہ چیزوں کے خلاف کوئی نئی رائے دینا بھی یقیناً بدعت میں شامل ہے۔ بدعت صرف عمل کا نام نہیں بلکہ نیا خیال بھی بدعت ہے‘ نیا نظریہ بھی بدعت ہے۔ وہ چیز جو دین کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو وہ بھی بدعت ہے۔

متذکرہ بالا آیت کے الفاظ ﴿وَمَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ﴾ ’’اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی‘‘ کا مصداق رسولؐ کے ساتھ ساتھ سُنّتِ رسولؐ بھی ہے‘ اور ﴿وَیَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ ’’اور چلے مسلمانوں کی راہ کے خلاف‘‘۔ اس ’’سبیل المؤمنین‘‘ کی وضاحت میں کرچکا ہوں کہ یہ کن ذرائع سے وجود میں آئی ہے۔ جو کوئی اس سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالے گا‘ چاہے وہ کوئی رسم ہو‘ کوئی خیال ہو‘ کوئی رائے ہو وہ راستہ قابل قبول نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کوئی رائے اکیلی نہیں ہوتی‘ اس کا پورا کنبہ ہوتا ہے۔ ایک نئی رائے آئے گی تو اس کے ساتھ ملی ہوئی چیزیں اس میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ اس نئے مکتب فکر کے روبرو ایک مرتبہ جب گفتگو ہو رہی تھی اور مَیں نے یہ بات کہی کہ آپ ایک بالکل نیا دین ایجاد کرلیں گے تو انہوں نے کہا: ’’نیا دین نہیں بلکہ نئی شریعت‘ نئی فقہ ہم ضرور بنانا چاہتے ہیں۔‘‘ بہرحال میں ان حضرات کے طرزِ عمل سے اعلانِ براءت کرتا ہوں اور یہ بات پوری طرح واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں کسی کمپرومائز کی گنجائش نہیں۔ اگر دین کے کسی معاملے میں ہم نے مداہنت کا راستہ اختیار کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین کوئی تفریق کرنے کی کوشش کی تو ہماری یہ ساری محنتیں اکارت چلی

جائیں گی اوران کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔

ہم اُس قرآن کے ماننے والے ہیں جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا‘ اور آپؐ پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی رہنمائی بہت سے طریقوں اور چینلز سے کی۔ اس پر تو علماء نے کتابوں کی کتابیں لکھ دی ہیں اور بیسیوں مثالیں دی ہیں۔ مثلاً یہ جو سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) ”اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ جس پر کہ آپؐ تھے مگر اس لیے کہ ہم ذرا جانچ لیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔“ غور کیجیے قرآن مجید میں کہاں ہے وہ آیت جس کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھی؟ تو معلوم ہوا کہ کوئی اور چینل ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ کو وہ بات کہی گئی تھی‘ کوئی اور بصیرتِ باطنی تھی جس کے ذریعے آپؐ کو یہ ہدایت دی گئی تھی۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں آپ کو مل جائیں گی جن سے ثابت ہو جائے گا کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو صرف قرآن ہی نہیں مل رہا تھا‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی بہت سے دوسرے چینلز سے بھی آپؐ کے پاس آ رہی تھی۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اُوْتِیْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) ”مجھے قرآن بھی دیا گیا اور اس جیسی چیز اور بھی۔“ یہی وہ چیز ہے جس نے سُنّت کی شکل میں ظہور کیا۔

سُنّت اور حدیث کا فرق

سُنّت درحقیقت کہتے ہیں سیرت‘ راستے اور طریقے کو۔ (السنة فی الاصل الطريقة والسيرة) رسول اللہ ﷺ کا جو راستہ اور طریقہ ہے اس کا علم ہمارے پاس دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ اوّلاً تواترِ عمل اور ثانیاً حدیث کا ریکارڈ۔ ان میں سے اہم تر واسطہ یا ذریعہ اُمّت کا تواترِ عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو دیکھ کر صحابہؓ نے عمل کیا‘ صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے عمل کیا۔ اس طرح یہ نسلاً بعد نسلٍ دیکھ کر منتقل ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طور سے قرآن منتقل ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحابہؓ نے سنا اور یاد کیا اور پھر صحابہ سے اگلوں نے سنا اور یاد کیا۔ اسی طرح یہ آگے چلتا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل

ہوتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے باقاعدہ چھپوا کر اس پر دستخط کر کے اور سرٹیفکیٹ دے کر اس کے نسخے تو دنیا کے اندر نہیں بھیجے تھے۔ قرآن تو رسول اللہ ﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ تک مابین الدُّفَّتین بھی جمع نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بعد میں دورِ صدیقیؓ میں جمع ہوا۔

چنانچہ اوّل درجے میں اللہ کے رسول ﷺ کا عمل ہے جس پر اُمّت کا تواترِ عمل ہے‘ اور پھر ثانوی درجے میں حدیث کا ریکارڈ ہے۔ حدیث کا ریکارڈ جمع کرنے کا جب مرحلہ آیا تو بہت سی چیزیں ایسی ہوسکتی ہیں کہ جن کی وجہ سے کوئی حدیث اس معیار پر پوری نہ اتر رہی ہو۔ ہوسکتا ہے اس کا اصل راوی فوت ہو چکا ہو اور اس کی بجائے کوئی دوسرے درجے کا راوی اسے روایت کر رہا ہو۔ اس طرح کے سارے امکانات موجود ہیں۔ لیکن تواترِ عمل میں اس طرح کا کوئی خلا پیدا نہیں ہوسکتا‘ لہٰذا سُنّت کے علم کا زیادہ بڑا ذریعہ (source) ہمارے پاس اُمّت کا تواترِ عمل ہے‘ جس نے سبیل المؤمنین کی شکل اختیار کی ہے اور اصل میں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ اہلِ ایمان کے اِس راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالنے کی کوششیں ہر دَور میں ہوتی رہی ہیں۔ ہر دَور اور ہر زمانے کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب یونان کی منطق آئی تو بہت سے لوگوں کو بہا کر لے گئی تھی۔ ایک دَور میں جدید سائنس کے زیر اثر سرسید احمد خان اور اُن کے حلقۂ اثر نے کچھ رائیں ایجاد کر لیں۔ لیکن یہ وقتی قسم کے معاملات ہوتے ہیں۔ ہمارا جو تسلسل ہے تواترِ عمل کا اور اس سے جو سبیل المؤمنین بنی ہے اس کی پیروی ہم پر لازم ہے۔ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اِن شاء اللہ قرآن مجید کی اس پوری تحریک اور دعوت کو لے کر چلیں گے اور کہیں بھی سبیل المؤمنین سے اپنا راستہ ہٹا لینے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ اسی میں عافیت اور حفاظت ہے۔ یہی ہمارے نزدیک قرآن کی رو سے اور سُنّتِ رسول ﷺ کے اعتبار سے صحیح راستہ ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْحَدِیْد

تمہیدی کلمات

سورۃ الحدید سے قرآن حکیم کی مکّی مدنی سورتوں کے چھٹے گروپ کی مدنی سورتوں کے سلسلے کا آغاز ہو رہا ہے جو سورۃ التحریم پر اختتام پذیر ہوگا۔ اس ضمنی گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کا حجم تقریباً سوا پارے کے برابر ہے' لیکن تعداد کے اعتبار سے یہ پورے قرآن میں مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس حوالے سے پہلے پانچ گروپس کی مدنی سورتوں کی ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کرلیں۔ پہلے گروپ میں سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ چار مدنی سورتیں ہیں جو تقریباً سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں اور حجم کے اعتبار سے یہ مدنی قرآن کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے گروپ میں سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ دو مدنی سورتیں ہیں۔ پھر تیسرے اور چوتھے گروپ میں صرف ایک ایک مدنی سورت ہے' یعنی تیسرے گروپ میں سورۃ النور اور چوتھے گروپ میں سورۃ الاحزاب۔ جبکہ پانچویں گروپ میں سورۂ محمد' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات تین مدنی سورتیں ہیں۔

زیر مطالعہ گروپ کی ان مدنی سورتوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سورتوں کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰہِ یا یُسَبِّحُ لِلّٰہِ سے ہوتا ہے۔ یعنی ان کے آغاز میں اللہ کی تسبیح کا ذکر فعل ماضی میں بھی ہے اور فعل مضارع میں بھی۔ عربی کا فعل مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے معنی دیتا ہے اس لیے ماضی اور مضارع کے ان دو صیغوں سے گویا پورے زمانے کا کُلّی طور پر احاطہ ہو گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے اندر جو چیز بھی ہے اس نے ہمیشہ اللہ کی تسبیح بیان کی ہے' ہر چیز اب بھی اُس کی تسبیح بیان کر رہی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ اس کی تسبیح کرتی رہے گی۔ ان

سورتوں کے آغاز کے اس مضمون کی مناسبت سے انہیں اَلْمُسَبِّحَات کا نام دیا گیا ہے۔ بعض لوگ سورۃ الاعلیٰ کو بھی اَلْمُسَبِّحَات کے اس گروپ میں شامل کرتے ہیں‘ لیکن یہ سورت اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ اس کے آغاز میں تسبیح کا صیغہ فعل امر ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ①﴾ یعنی حکم کی صورت میں آیا ہے۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مکّی مدنی سورتوں کے زیر مطالعہ (چھٹے) گروپ میں دس مدنی سورتیں ہیں جن میں سے پانچ اَلْمُسَبِّحَات ہیں اور سورتوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ ہے۔

ان مدنی سورتوں کے بارے میں تیسری اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ یہ سب سورتیں (سوائے سورۃ التغابن کے) آنحضورﷺ کے مدنی دور کے نصف آخر میں یعنی سن ۵ ہجری کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کی صفوں میں جوشِ جہاد‘ ذوقِ شہادت‘ جذبۂ انفاق وغیرہ کے حوالے سے بحیثیت مجموعی ضعف واضمحلال کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب‘ معاذ اللہ‘ یہ ہرگز نہیں کہ ’’السابقون الاوّلون‘‘ کے جذبے میں کوئی کمی آ گئی تھی‘ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مسلمانوں کی مجموعی تعداد میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو ہجرت کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ سب لوگ تربیت اور آزمائش وابتلاء کے ان تمام مراحل سے نہیں گزرے تھے جن کا سامنا مکّی دور کے اہلِ ایمان کر چکے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے مقابلے میں نئے شامل ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی‘ اس لیے جماعت کے اجتماعی کردار وعمل پر بھی ان ہی کا رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے اس رنگ کے ’’اوسط معیار‘‘ کو السابقون الاوّلون کے خصوصی معیار کے پیمانہ سے نہیں پرکھا جا سکتا تھا۔

مسلمانوں کی صفوں میں مذکورہ ضعف کا ذکر سورۃ الانفال کی آیت ۶۶ میں ﴿عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ﴾ کے الفاظ میں بھی آیا ہے۔ آیات ۶۵‘۶۶ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے تو ایک مؤمن دس کُفّار پر بھاری ہو سکتا تھا‘ لیکن اب چونکہ تم میں کمزوری آ چکی ہے اس لیے اب ہم نے تمہارے مقابلے کے معیار میں بھی نرمی کر دی ہے۔ چنانچہ اب اگر تم اپنے سے دوگنا کُفّار کا مقابلہ بہادری اور جواں مردی سے کرو گے تو ہم ان پر تم لوگوں کو فتح دیں گے۔ بہرحال مذکورہ کمزوری کے اثرات کے باعث ان سورتوں میں جابجا مسلمانوں کو جھنجوڑنے اور ان کی گرفت کرنے کا انداز ملتا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الصّف کی دوسری آیت کا اسلوب بہت

واضح ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ ’’اے اہلِ ایمان! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟‘‘ زیر مطالعہ سورت یعنی سورۃ الحدید کی اس آیت کا انداز بھی بالکل ایسا ہی ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۸) ’’تمہیں کیا ہے، تم اللہ پر پختہ ایمان کیوں نہیں رکھتے؟‘‘ پھر سورۃ الحدید کی اس آیت کا لب ولہجہ بھی ملاحظہ کریں: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۰) ’’تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟‘‘ سورۃ الجمعہ کی آخری آیت کا یہ انداز بھی بہت سخت ہے: ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْۤا اِلَیْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ﴾ ’’جب انہوں نے دیکھا کسی کاروبار یا کسی اور دلچسپی کی چیز کو تو وہ اس کی طرف لپک گئے اور چھوڑ گئے آپ کو (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) کھڑے ہوئے۔‘‘

اس سورت میں یقیناً روئے سخن منافقین کی طرف بھی ہے (ان سورتوں میں منافقت کے موضوع پر ایک مکمل سورت (سورۃ المنافقون) بھی موجود ہے اور پھر سورۃ الحدید میں منافقت کے مرض کی علامات سے لے کر تشخیص تک گویا پوری پیتھالوجی بیان ہوئی ہے) لیکن مجموعی طور پر اصل خطاب منافقین سے نہیں بلکہ ’’ضعفاء‘‘ سے ہے۔ یعنی ان میں ان کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو ’’ہرچہ بادا باد‘‘ کے سے جذبے کے ساتھ ہر حالت اور ہر قیمت پر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کرنے سے معذور ہیں۔ چنانچہ منافقت یا منافقین کے معاملے میں ان سورتوں کا انداز سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ جیسا نہیں ہے، کیونکہ ان دو سورتوں کی متعلقہ آیات میں اصل خطاب ہی منافقین سے ہے، جبکہ زیر مطالعہ سورتوں میں اگر کہیں مسلمانوں کی صفوں کے اندر موجود کمزوری کو موضوع بنایا گیا ہے تو وہاں اصل خطاب ضعفاء سے ہے نہ کہ منافقین سے۔

جہاں تک ایمان کی پختگی اور کمزوری کے حوالے سے اہلِ ایمان کے درمیان انفرادی سطح پر فرق و تفاوت کا تعلق ہے تو یہ ایک فطری بات ہے اور یہ فرق شروع سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (آیت ۱۰۰)

''اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے' اور وہ جنہوں نے اُن کی پیروی کی نیکوکاری کے ساتھ' اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ ترین درجات پر فائز اہلِ ایمان کے درمیان بھی فرق تھا۔ کچھ لوگ ''السابقون الاوّلون'' تھے اور کچھ وہ تھے جو ان کے نقشِ قدم پر چلے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ! (اس مضمون کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۰ کی تشریح۔)

سورۃ التوبہ کی درج بالا آیت سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اہلِ ایمان کے درجات کے فرق کو سمجھنا اور ان کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے: ع ''گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی!'' بہرحال جب تک اس فلسفے کو نہیں سمجھا جائے گا نہ ''کمزور مسلمان'' کی اصطلاح سمجھ میں آئے گی اور نہ ہی ان آیات کا مفہوم واضح ہو گا جن میں ''ضعفاء'' یعنی کمزور مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

''حفظِ مراتب'' کا یہ فلسفہ آج کل ہم جیسے مسلمانوں کو ''اہلِ ایمان'' کی صفوں میں جگہ دلانے کا جواز اور راستہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ ''نسلی مسلمان'' ہیں۔ یعنی ہم میں سے اکثر اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم مسلمان والدین کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں ہمارے ارادے' اختیار یا انتخاب کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا عام مسلمان اپنے حالات اور ماحول کے مطابق اللہ' رسول' آخرت' نماز روزہ وغیرہ کا تعارف تو بچپن میں ہی سیکھ لیتا ہے' لیکن ایمانِ حقیقی اور عمل کے اعتبار سے اس کا دامن خالی ہی رہتا ہے (اِلّا ما شاء اللہ)۔ اس اعتبار سے آج ہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا تعلق اس ''مسلمانی'' سے ہے جس کا ذکر سورۃ الحجرات کی اس آیت میں ہوا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدّو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

سورۃ الحجرات کے مطالعے کے دوران اس آیت کا پس منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال جس طرح اس آیت کے مخاطب لوگوں کی اکثریت نے حالات کا رخ دیکھ کر ''حادثاتی'' طور پر اسلام قبول کیا تھا' اسی طرح ہم بھی اپنی پیدائش کے ''حادثے'' کی وجہ سے مسلمان ہیں۔

ہم نے اسلام کو ایک موروثی نظریے کے طور پر تو قبول کیا ہے‘ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری اکثریت ایمان اور اسلام کے تقاضے پورے کرنے کی فکر سے بالکل ہی لاتعلق ہو چکی ہے (اِلّا ماشاءاللہ)۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ایسے تمام لوگ حقیقی ایمان سے تہی دامن ہونے کے باوجود منافق نہیں‘ اس لیے کہ وہ کسی کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام نہیں لائے۔ چنانچہ ان سب لوگوں کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ ’’کمزور مسلمان‘‘ ہیں۔

اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ سب مسلمان ’’بحیثیت مسلمان‘‘ برابر نہیں ہیں۔ ایمان کی پختگی اور عمل کے معیار سے ان کے اپنے اپنے درجات ہیں اور ان درجات کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے درجات میں پائے جانے والے اس فرق کو نہیں سمجھا انہیں سورۃ الحجرات کی مذکورہ آیت کے بارے میں بھی مغالطہ ہوا ہے کہ اس میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ اسی آیت میں آگے ان اسلام قبول کرنے والوں کو یہ ضمانت بھی دی گئی ہے: ﴿وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَا یَلِتۡکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا ؕ﴾ ’’اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی جائے گی‘‘۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں وہ مسلمان ہی تھے‘ کیونکہ منافق کا تو کوئی عمل قابلِ قبول ہے ہی نہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں کی صفوں میں منافق بھی تھے لیکن مذکورہ آیت میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو مخاطَب کیا گیا ہے جو اگرچہ دیکھا دیکھی مسلمان ہوئے تھے‘ لیکن اس میں ان کی بدنیتی شامل نہیں تھی۔

آج ہماری غالب اکثریت بلاشبہ ’’کمزور مسلمانوں‘‘ پر مشتمل ہے‘ اس لیے آج ہماری ہدایت کے لیے قرآن کا یہ حصّہ (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم) بہت اہم ہے۔ آج کا مسلمان اگر ان دس سورتوں کو سمجھ لے تو اس کا یہ عمل ایسے ہوگا جیسے اس نے پورے قرآن کو سمجھ لیا۔ کیونکہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن حکیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ مثلاً منافقت اور منافقین کا تذکرہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ خصوصاً سورۃ النساء‘ سورۃ التوبہ اور سورۂ محمد میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں شامل گیارہ آیات پر مشتمل ایک مختصر سی سورت یعنی سورۃ المنافقون میں اس پورے مضمون کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایمان کی بحث سے پورا قرآن بھرا پڑا ہے۔ دو تہائی قرآن مکّی سورتوں پر مشتمل ہے اور ان مکّی سورتوں میں تذکیر بآلاء اللہ

کے علاوہ توحید‘ رسالت اور آخرت کے موضوعات کے تحت ساری بحث ایمان سے ہی متعلق ہے۔ اس قدر وسیع اور مفصل مضمون کو اس مجموعے کی سورۃ التغابن (۱۸ آیات) میں سمو دیا گیا ہے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ان دس سورتوں میں پورے قرآن کے مضامین کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے چھ سورتوں (سورۃ الحدید‘ سورۃ الصّف‘ سورۃ الجمعہ‘ سورۃ المنافقون‘ سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم) کو ہم نے اپنے منتخب نصاب میں شامل کیا ہے۔ جہاں تک سورۃ الحدید کے تعارف کا تعلق ہے‘ یہ بہت جامع اور بہت بلند مرتبہ سورت ہے۔ اَلْمُسَبِّحَات میں ممتاز مقام کی وجہ سے اسے اُمُّ الْمُسَبِّحَات کہا جاتا ہے۔ ہمارے منتخب نصاب کا حصّہ ششم اسی سورت کے ۷ دروس پر مشتمل ہے۔ میں اکثر تحدیثِ نعمت کے طور پر ذکر کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اس سورت کا خصوصی فہم اور انشراح عطا فرمایا ہے‘ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے مجھے یہ سورت عطا فرما دی ہے۔ پچھلی نصف صدی سے اس پر میرا غور وفکر جاری ہے اور میں نے اس پر بہت طویل اور مفصّل دروس بھی دیے ہیں۔ بہرحال اس مضمون کے لیے یہ سطور زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس سورت پر میرے سلسلہ وار دروس کی آڈیو‘ ویڈیو ریکارڈنگ موجود ہے۔ مفصّل دروس کی ریکارڈنگ ۱۵ گھنٹے پر مشتمل ہے‘ جبکہ نسبتاً مختصر دروس کا دورانیہ چھ گھنٹے ہے۔ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات میرے ان دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ (۱)

آیات ۱ تا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾ ہُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ ہُوَ

۱۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے متذکرہ بالا دروس کی ترتیب وتدوین کے بعد انہیں ۳۶۸ صفحات پر مشتمل کتاب بعنوان ’’اُمّ المُسَبِّحات یعنی سورۃ الحدید کی مختصر تشریح‘‘ کی صورت میں مکتبہ خُدّام القرآن لاہور نے شائع کیا ہے۔ (مرتّب)

بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ
سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی
الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ
فِیۡہَا ؕ وَ ہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۴﴾
لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵﴾
یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَ ہُوَ عَلِیۡمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۶﴾

آیت ۱ ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ﴾ ”تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔“

ان سورتوں (اَلْمُسَبِّحَات) کا یہ مضمون بہت اہم ہے۔ آگے چل کر سورۃ الحشر اور سورۃ الصّف میں یہ آیت ”مَا فِیۡ“ کے اضافے کے ساتھ اس طرح آئے گی: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ﴾ اور پھر سورۃ الجمعہ اور سورۃ التغابن میں مزید پُرزور انداز میں فعل مضارع کے ساتھ یوں آئے گا: ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ﴾۔

کائنات کی ہر چیز کس طرح اللہ کی تسبیح کرتی ہے؟ اس کی ایک صورت تو ”تسبیح حالی“ کی ہے جو ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز اپنی زبانِ حال سے اللہ کی تسبیح کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایک تصویر ہے جو اپنے مصور کے کمالِ فن یا عدمِ مہارت پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک خوبصورت تصویر زبانِ حال سے اپنے مصوّر کی تعریف کرتی نظر آتی ہے اسی طرح اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ میرا پیدا کرنے والا‘ میرا صانع‘ میرا خالق‘ میرا مصور ہر عیب سے پاک‘ ہر نقص سے بالا اور ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے‘ اُس کے علم‘ اُس کی قدرت اور اُس کی حکمت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دوسری صورت ”زبانی تسبیح“ کی ہے جو کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۂ حٰمٓ السَّجدۃ کی آیات ۲۰ اور ۲۱ میں قیامت کے اس منظر کا ذکر ہے جب انسانوں کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اس پر وہ لوگ حیرت سے اپنی کھالوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ جواب میں ان کی کھالیں کہیں گی: ﴿اَنۡطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ﴾ (آیت ۲۱) کہ آج اُس اللہ

نے ہمیں بھی زبان دے دی ہے جس نے ہر شے کو زبان دی ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ بنی اسرائیل کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی تسبیح کے لیے ایک طریقہ تفویض کر رکھا ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۴۴)

’’اُسی کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور (وہ تمام مخلوق بھی) جو ان میں ہے۔ اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ تسبیح کرتی ہے اُس کی حمد کے ساتھ‘ لیکن تم نہیں سمجھ سکتے ان کی تسبیح کو۔‘‘

بہرحال کائنات کی ہر چیز اپنی زبانِ حال سے بھی اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی عطا کردہ اپنی مخصوص زبان سے بھی اس کی تعریف و توصیف میں مشغول و مصروف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تسبیح کی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں جو کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①﴾ ’’اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے یہ دو اسماء اکٹھے ایک ساتھ بہت تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کا یہ جوڑا معنوی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ **العزیز** وہ ہستی ہے جس کا اختیار مطلق ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی سطح پر مطلق العنانیت کا تجربہ ہمیشہ بہت تلخ رہا ہے۔ عملی طور پر ہمارے ہاں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں مطلق العنانیت آتی ہے‘ وہاں اختیارات کا ناجائز استعمال ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ پولیٹیکل سائنس کا تو اس حوالے سے آزمودہ فارمولا یہ ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ جب کسی ملک کا آئین بنایا جاتا ہے اور معاشرے کے لیے قوانین وضع کیے جاتے ہیں تو متعلقہ ماہرین کی ساری کوشش اختیارات کو مشروط کرنے اور ان میں توازن قائم کرنے پر مرکوز ہوتی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ایسی صاحبِ اختیار ہستی ہے جس کے اختیارات کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی اس کے اختیارات کسی شرط سے مشروط ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ’’الحکیم‘‘ بھی ہے۔ وہ اپنے مطلق اختیارات میں خود ہی اپنی حکمت سے توازن قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ **هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ** کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ زبردست ہے‘ وہ اپنی تمام مخلوقات پر غالب ہے‘ اس کے اختیارات

مطلق ہیں، لیکن اس کا کوئی کام اس کا کوئی عمل اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

آیت ۲ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اُسی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

آیت کے آغاز میں جو حرفِ جار ''ل'' آیا ہے یہ تملیک کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور استحقاق کے لیے بھی۔ یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی de facto بھی اُسی کی ہے اور de jure بھی —— اُسی کو حاکمیت کا حق پہنچتا ہے اور بالفعل بھی وہی حاکم ہے۔ اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک ہو اور بالفعل بھی وہی مالک ہے۔

اس سورۂ مبارکہ میں دین کا ذکر خصوصی طور پر بطور ایک نظام کے کیا گیا ہے اور یہ نظام صرف حکومتِ الٰہیہ کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات بار بار نمایاں کی گئی ہیں جن کا تعلق طاقت، حکومت، قدرت اور اختیار سے ہے۔

﴿يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲﴾ ''وہی زندہ رکھتا ہے، وہی مارتا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ کی پہلی چھ آیات پورے قرآن حکیم میں اس اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر فلسفے اور منطق کی سطح پر جامع ترین انداز میں ہوا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ موقع ایسی تفصیلات میں جانے کا نہیں۔

آیت ۳ ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ ''وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔''

ایک انسان کے لیے اس کیفیت کو سمجھنا یقیناً مشکل ہے کہ ہر زمان، ہر مکان اگر وہ ہی وہ ہے تو پھر باقی سب کیا ہے۔ غالبؔ نے اس صورتِ حال سے متعلق انسانی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ؎

جبکہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس آیت کے بارے میں امام رازیؒ کا درج ذیل قول بہت فکر انگیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس آیت کو پڑھ کر وہ جلالِ ذات کے رعب کے باعث ساکت و ششدر ہوئے کھڑے ہیں۔ لکھتے ہیں: اِعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِيْقٌ مُهِيْبٌ ''جان لو کہ یہ بہت مشکل، بہت

گہرا اور بڑا پُر ہیبت مقام ہے!'' اس کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ گویا بقول شاعر ع
''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!'' اس راستے پر خبردار ہو کر چلنا' اب تمہارا پاؤں تلوار کی دھار پر آ گیا ہے!

صوفیاء نے ''وحدت الوجود'' کا فلسفہ اسی آیت سے اخذ کیا ہے' لیکن یہ فلسفے کا بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ ''وحدت الوجود'' کی تعبیر میں کچھ لوگوں نے ''ہمہ اوست'' کا تصوّر گھڑا ہے جس کے کفر و شرک ہونے میں کسی اہلِ علم کو اختلاف نہیں ہے۔ بہر حال ''وحدت الوجود'' کے بارے میں یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ البتہ میں نے اپنے مذکورہ دروس میں اپنی حد تک اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (۱۸۹۶۔ ۱۹۸۴ء) سے مجھے اپنی اس وضاحت کی سند بھی مل چکی ہے۔ ایک مرتبہ اسی سورت کے میرے ایک درس میں پروفیسر صاحب بھی موجود تھے۔ درس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اس ''وحدت الوجود'' کے مسئلے کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں' لیکن آپ نے اس ایک درس میں اسے جس انداز میں واضح کیا ہے میں آج تک نہیں کر سکا۔ یہاں ان سطور میں اس مسئلے کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ تفصیل معلوم کرنے کے خواہش مند حضرات سورۃ الحدید پر میرے متعلقہ دروس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال اس آیت کا آسان مفہوم یہ ہے کہ یہ کائنات ''حادث'' ہے۔ ایک وقت تھا جب یہ موجود نہیں تھی اور جب یہ موجود نہیں تھی اُس وقت کون موجود تھا؟ ظاہر ہے اللہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ تو اس کائنات کا آغاز کہاں سے ہوا؟ اللہ سے! پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کائنات میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٦﴾ (الرحمٰن) ''جو کوئی بھی اس (زمین) پر ہے فنا ہونے والا ہے۔'' تو جب یہ سب کچھ نہیں رہے گا تو اُس وقت کون موجود ہو گا؟ ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝٢٧﴾ (الرحمٰن) ''اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا چہرہ جو بہت بزرگی والا اور بہت عظمت والا ہے۔'' تو جب کچھ نہیں رہے گا تو اللہ اُس وقت بھی موجود ہو گا۔ تو پھر ''آخر'' کون ہوا؟ ظاہر ہے کہ اللہ! اب یوں سمجھیں کہ اوّل اور آخر کے مابین ظاہر بھی وہ ہے اور باطن بھی وہ ہے۔

اس مشکل مضمون کو درج ذیل حدیث نے عام لوگوں کے لیے آسان کر دیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ' رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ' فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی' وَمُنْزِلَ التَّوْرَاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْفُرْقَانِ' اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْءٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ' اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٌ))(۲)

''اے اللہ آسمانوں اور زمین کے رب! اے عرشِ عظیم کے مالک! اے ہمارے رب اور ہر چیز کے پروردگار! اے دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے اور تورات' انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اے اللہ! تُو ہی اوّل ہے' پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور تُو ہی آخر ہے' تیرے بعد کوئی چیز نہ ہو گی' اور تُو ہی ظاہر ہے' تجھ سے بالاتر کوئی چیز نہیں' اور تُو ہی ایسا باطن ہے کہ تجھ سے مخفی کوئی چیز نہیں۔''

﴿وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ③﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

جب ہر زمان' ہر مکان وہ ہی وہ ہے' وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو کائنات کی کوئی ذرّہ بھر چیز بھی اُس سے پوشیدہ کیسے ہو سکتی ہے! بلکہ وہ تو انسان کے دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ اس حوالے سے سورۂ قٓ کی یہ آیت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ⑯﴾ ''اور ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں جو اُس کا نفس وسوسے ڈالتا ہے' اور ہم تو اُس سے اُس کی رَگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر (عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ) ہونے کا اعلان ہوا ہے' جبکہ زیر مطالعہ آیت میں اُس کے علمِ کُل کا بیان ہے کہ اُسے ہر چیز کا علم ہے (وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بہت تکرار کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۴ ﴿ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی

۲۔ صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔

الْعَرْشِ ؕ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں' پھر وہ متمکّن ہوا عرش پر۔''

﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔''

بالکل یہی الفاظ اس سے پہلے سورۂ سبا کی آیت ۲ میں بھی آ چکے ہیں۔ اس فقرے میں بہت سی چیزوں کا احاطہ ہو گیا' مثلاً زمین میں پانی جذب ہوتا ہے' مختلف قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں' مُردے دفن ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور فرشتے احکامِ الٰہی لے کر اُترتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے کی مثال بخارات کی ہے' اور پھر فرشتے بھی فوت ہونے والے انسانوں کی ارواح اور دنیا کے حادثات و واقعات کی رپورٹس لے کر اوپر جاتے ہیں۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴﴾ ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

جو کچھ اچھے یا بُرے اعمال تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ان کا چشم دید گواہ ہے۔

آیت ۵ ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ''بادشاہی'' کے بارے میں تکرار و تاکید کا خصوصی اسلوب ملاحظہ ہو۔ آیت ۲ کے الفاظ ہو بہو یہاں پھر دہرائے گئے ہیں۔

اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اسی طرح اس کے علاوہ کوئی اور حاکم و مقتدر بھی نہیں۔ چنانچہ جس طرح اللہ کو اکیلے معبود کے طور پر ماننا ضروری ہے' اسی طرح توحید کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کی زمین پر صرف اُسی کی بادشاہی قائم ہو اور اُس کے تمام احکام عملاً نافذ ہوں۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵﴾ ''اور تمام معاملات اُسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

آیت ۶ ﴿يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ﴾ ’’وہ پروتا ہے رات کو دن میں اور پروتا ہے دن کو رات میں۔‘‘

یہ مضمون ان ہی الفاظ کے ساتھ قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے۔

﴿وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾ ’’اور وہ جانتا ہے اس کو بھی جو سینوں کے اندر ہے۔‘‘

نوٹ کیجیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم کا ذکر بہت تکرار کے ساتھ ہوا ہے‘ پہلے فرمایا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ پھر فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا...﴾ (آیت ۴) اور اب یہاں اس آیت میں بتایا گیا کہ وہ سینوں کے رازوں کا بھی علم رکھتا ہے۔

ان چھ ابتدائی آیات پر مشتمل یہ پُرشکوہ تمہید گویا ایک اعلان ہے کہ خبردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم یہ کس کا کلام پڑھ رہے ہو‘ کس سے ہم کلام ہو رہے ہو! ان تمہیدی آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت‘ اُس کی قدرت‘ اُس کی بادشاہی اور خصوصی طور پر اُس کے علم کا تعارف ہے۔ یہ گویا توحید فی العقیدہ کا بیان ہے۔ توحید کا یہ عقیدہ عملی میدان میں بندوں سے کیا تقاضا کرتا ہے اس کا ذکر اب آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں توحید کے دو بنیادی تقاضے بتائے گئے ہیں۔

آیات ۷ تا ۱۱

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ

مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ
اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑩ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ⑪

آیت 7 ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ﴾
''ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُن سب میں سے جن میں اُس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔''

خلافت کے حوالے سے انسان کو سب سے زیادہ اختیار تو اپنے جسم پر عطا کیا گیا ہے۔ اس میں اس کے مختلف اعضاء ہیں‘ طاقتِ جسمانی‘ طلاقتِ لسانی‘ ذہانت و فطانت اور دوسری بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ پھر مال و دولت‘ اولاد اور دوسری بے شمار نعمتیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی ان خداداد صلاحیتوں اور نعمتوں کو اللہ کی رضا کے لیے اس کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ واضح رہے کہ ''نفق'' کا لفظ مال و دولت خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جان خرچ کر دینے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِم کے معنی ہیں رقم ختم ہوگئی اور نَفَقَ الْفَرس کے معنی ہیں گھوڑا مر گیا۔ یہاں یہ آیت پڑھتے ہوئے ضروری ہے کہ سورۃ الحجرات کی اس آیت کو بھی ذہن میں تازہ کر لیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر‘ پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

ان دونوں آیات میں دو دو مطالبات آئے ہیں‘ پہلا مطالبہ دونوں میں مشترک ہے یعنی ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کہ ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسولؐ پر‘ جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے۔ جبکہ

دوسرے مطالبے کے حوالے سے سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیت میں جہاد کا ذکر ہے کہ اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد کرو‘اور زیر مطالعہ آیت میں ہر اُس چیز کے انفاق کا حکم ہے جس پر انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے۔ظاہر ہے اس میں انفاقِ مال بھی شامل ہے اور بذلِ نفس یعنی انفاقِ جان بھی۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾ ’’پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے (اپنے مال و جان کو) خرچ کیا‘ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔‘‘

جس خوش نصیب نے مذکورہ دونوں مطالبات پورے کر دیے‘یعنی اسے یقین والا ایمان بھی نصیب ہو گیا اور اس نے اپنی زیرِ ملکیت ہر چیز کو اللہ کی رضا کے لیے پیش بھی کر دیا تو اس کے گویا وارے نیارے ہو گئے۔وہ بہت بڑے اجر کا مستحق ٹھہرا——مضمون کے حوالے سے یہاں آیات کے ربط و نظم کی خوبصورتی اور مندرجات کی ترتیب ملاحظہ کیجیے کہ پہلے ایک آیت میں دو مطالبات کا ذکر کر کے ان کے بارے میں ترغیب دی گئی ہے۔اب اس کے بعد ان میں سے ہر مطالبے سے متعلق دو دو آیات اس طرح آ رہی ہیں کہ پہلی آیت میں زجر یعنی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ہے‘جبکہ دوسری میں راہنمائی اور ترغیب دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ﴾ ’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نہیں ایمان رکھتے اللہ پر!‘‘

یہ پہلے مطالبے یعنی ’’ایمان‘‘ سے متعلق گویا زجر و ملامت اور ایک طرح سے تنبیہ کا انداز ہے۔

﴿وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ ’’جبکہ رسول (محمد ﷺ) تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان رکھو اپنے رب پر‘‘

ہمارے رسولؐ ابھی تمہارے مابین موجود ہیں‘اور وہ تم لوگوں کو براہِ راست ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ ’’اور دیکھو! وہ تم سے عہد بھی لے چکا ہے‘‘

اگر تم ایمان کے دعوے دار ہو تو ذرا غور کرو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کتنے عہد کر رکھے

ہیں۔ایک عہد تو وہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے تم سے عالمِ ارواح میں لیا تھا: ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' اور تم سب نے اس سوال کے جواب میں ﴿بَلٰی﴾ کہا تھا (بحوالہ الاعراف:۱۷۲)۔اس کے بعد تم ﴿سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا﴾ (بحوالہ البقرۃ:۲۸۵ والمائدۃ:۷) کا عہد بھی کر چکے ہو۔اس عہدِ اطاعت کے علاوہ تم نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو اللہ کے ہاتھ بیچنے کا عہد بھی کر رکھا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ''یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے''۔تو تم لوگ اپنے رب کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدوں اور معاہدوں کا تو لحاظ کرو:

﴿اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾﴾ ''اگر تم حقیقتاً مؤمن ہو!''

یہ ڈانٹ سننے کے بعد ہر بندۂ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکے اور اپنا جائزہ لے کہ کیا اس کے دل میں حقیقی ایمان موجود ہے یا کچھ خلا سا ہے؟ الحمد للہ ہم سب مسلمان تو ہیں، کسی نہ کسی درجے میں نماز روزہ وغیرہ کا تقاضا بھی پورا کر رہے ہیں، لیکن اللہ کرے ہمیں احساس ہو جائے اور ہم اپنا اپنا جائزہ لیں کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کیا ابھی تک ہمیں حقیقی ایمان بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں! اور اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ واقعی اس کے دل میں اس پہلو سے ابھی خلا موجود ہے تو پھر اسے یہ معلوم کرنے کے لیے بھی تگ و دو کرنی چاہیے کہ وہ یقین والا ایمان کہاں سے ملے گا۔اگلی آیت میں اس حوالے سے راہنمائی فرمائی جا رہی ہے۔

آیت ۹ ﴿ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے جو اپنے بندے (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر یہ آیاتِ بینات نازل کر رہا ہے تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف۔''

یعنی یقین والے ایمان کا منبع و سرچشمہ اللہ کی یہ کتاب ہے۔اگر تم اس کتاب کو سمجھ کر پڑھو گے، اس پر فکر و تدبر کرو گے تو تمہارے اندر ایک ہلچل برپا ہو جائے گی، تمہاری روح کے تاروں میں خود بخود سرسراہٹ پیدا ہو گی اور تم خود محسوس کرو گے۔بقولِ اقبال ؎

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بُوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے، تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے!

دراصل ایمان تمہاری روح کے اندر خفتہ (dormant) حالت میں پہلے سے موجود ہے‘ بس اسے فعال (active) کرنے کی ضرورت ہے۔ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان کو فعال کرنے کا نسخہ پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے‘ یعنی آیاتِ قرآنیہ۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹﴾ ’’اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں بہت رؤف اور رحیم ہے۔‘‘

وہ تمہارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ ایمانِ حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الشوریٰ میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ خود حضور ﷺ کو بھی ایمان قرآن مجید ہی سے ملا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۲﴾

’’اور (اے نبی ﷺ!) اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے‘ لیکن اس (قرآن) کو ہم نے ایسا نُور بنایا ہے جس کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔‘‘

یعنی اس سے پہلے نہ تو آپؐ تورات سے واقف تھے اور نہ ہی آپؐ انجیل کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ آپ تو اُمّی تھے۔ لیکن جب ہم نے قرآن کریم کو نُور بنا کر آپؐ کے دل پر اُتارا تو اس سے آپؐ کا باطن نُورِ ایمان سے جگمگا اٹھا اور آپؐ نوعِ انسانی کے لیے روشنی کا مینار بن گئے۔ اب آپؐ لوگوں کو ہدایت دیں گے اور انہیں سیدھے راستے کی طرف بلائیں گے۔ اسی مضمون کو مولانا ظفر علی خان نے بڑی خوبصورتی اور سادگی سے یوں بیان کیا ہے: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

ان دو آیات میں پہلے مطالبے یعنی ''ایمان'' سے متعلق پہلے ڈانٹ پلائی گئی کہ تمہارا ایمان پختہ کیوں نہیں ہے؟ یہ ڈِھل مل ایمان لیے کیوں پھر رہے ہو جس میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھے ہوئے ہیں؟ اگر تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو اس کمزوری کو دور کیوں نہیں کرتے ہو؟ کمزور ایمان کے ساتھ گزارا کیوں کر رہے ہو؟ پھر دوسری آیت میں راہنمائی بھی کر دی گئی کہ ایمان کی کمزوری کو دور کرنے اور حقیقی ایمان کے حصول کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرو! قرآن کا یہی مطالبہ ہم سے بھی ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم بات ہمیشہ کے لیے پلّے باندھ لیجیے کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنے سے نہ تو قرآن دل میں اترتا ہے اور نہ ہی اس سے جذبے کو تحریک ملتی ہے۔ ترجمہ پڑھنے سے آپ کچھ آیات کا مفہوم تو سمجھ لیں گے اور کچھ معلومات بھی آپ کو حاصل ہو جائیں گی، مگر قرآن آپ کے دل کے تاروں کو چھوئے گا نہیں، اور نہ ہی اس کی تاثیر آپ کی روح تک پہنچے گی۔ لہٰذا اگر آپ چاہتے ہیں کہ قرآن آپ کی روح کو فیضِ ملکوتی سے سیراب اور آپ کے دل کو نُورِ ایمانی سے منور کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن کو اس کی زبان میں پڑھیں اور سمجھیں۔ بقول اقبال: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف!

ظاہر ہے کسی کے ضمیر پر قرآن کا نزول تبھی ممکن ہے جب وہ قرآن کی زبان یعنی عربی سے واقف ہوگا اور قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارت کو براہِ راست سمجھے گا۔ اس کے لیے وہ پڑھے لکھے حضرات جو عربی زبان سے نابلد ہیں خصوصی طور پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوں گے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک علوم وفنون سیکھتے رہے لیکن قرآن کی زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے کوئی منصوبہ بندی اور کوئی کوشش نہ کی۔ ایسے تمام حضرات کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک سال اس کام کے لیے ضرور وقف کریں اور کم از کم اس حد تک عربی زبان ضرور سیکھیں کہ قرآن مبین کو پڑھتے ہوئے انہیں اس کی آیاتِ بینات کا مفہوم تو معلوم ہو۔ (خواہش مند حضرات اس مقصد کے لیے قرآن اکیڈمی کے تحت چلنے والے رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لے سکتے ہیں۔) —— یہ تو تھی توحید کے پہلے مطالبے (ایمان) سے متعلق ڈانٹ ڈپٹ اور راہنمائی۔ اور اب دوسرے مطالبے سے متعلق ڈانٹ:

آیت ۱۰ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ

﴿وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں‘ جبکہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت!‘‘

یہ جو تم بڑے بڑے محل تعمیر کر رہے ہو اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں لگاتے چلے جا رہے ہو‘ ان سے آخر کب تک استفادہ کرو گے؟ تم تو آج ہو‘ کل نہیں ہو گے۔ تمہارے بعد تمہاری اولاد میں سے بھی جو لوگ ان جائیدادوں کے وارث بنیں گے وہ بھی اپنے وقت پر چلے جائیں گے۔ پھر جو اُن کے وارث بنیں گے وہ بھی نہیں رہیں گے۔ بالآخر تمہارے اس سب کچھ کا اور پوری کائنات کا حقیقی وارث تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ تم نے اِدھر ہی چھوڑ کر چلے جانا ہے تو پھر غیر ضروری دولت اکٹھی کرنے میں کیوں وقت برباد کر رہے ہو؟ اور کیوں اسے سینت سینت کر رکھ رہے ہو؟ واضح رہے کہ انفاق سے مراد یہاں انفاقِ مال بھی ہے اور بذلِ نفس (جان کھپانا) بھی۔ یہ نکتہ قبل ازیں آیت ۷ کے مطالعے کے دوران بھی زیر بحث آیا تھا اور اب اگلے فقرے میں مزید واضح ہو جائے گا:

﴿لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ’’تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے انفاق کیا اور قتال کیا فتح سے پہلے وہ (فتح کے بعد انفاق اور قتال کرنے والوں کے) برابر نہیں ہیں۔‘‘

وضاحت کے لیے یہاں انفاق اور قتال کا ذکر الگ الگ آ گیا ہے۔ یعنی ’انفاق‘ مال خرچ کرنے کے لیے اور ’قتال‘ جان کھپانے کے لیے۔ چنانچہ یہاں واضح کر دیا گیا کہ آیت ۷ میں جس انفاق کا ذکر ہوا تھا اس سے مال و جان دونوں کا انفاق مراد تھا اور ظاہر ہے انفاقِ جان کا سب سے اہم موقع تو قتال ہی ہے۔ میدانِ جنگ سے غازی بن کر لوٹنے کا انحصار تو حالات اور قسمت پر ہے‘ لیکن میدانِ کارزار میں اترنے کا مطلب تو بہر حال یہی ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد نے اپنی نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر قربانی کے لیے پیش کر دی۔

اس آیت میں خاص بات یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اہلِ ایمان جنہوں نے ابتدائی دور میں اس وقت قربانیاں دیں جبکہ اسلام کمزور تھا اور مسلمانوں کی طاقت بہت کم تھی‘ ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ اور بعد کے مسلمان جنہوں نے یہی اعمال بعد میں سرانجام دیے‘ ثواب و مرتبہ میں برابر نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط﴾ ’’ان لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کے مقابلے میں جنہوں نے انفاق اور قتال کیا فتح کے بعد۔‘‘

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾﴾ ’’اگرچہ ان سب سے اللہ نے بہت اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

حضور ﷺ کی سربراہی میں کفر و باطل سے جنگ میں پہلی واضح فتح تو صلح حدیبیہ تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے خود فتح مبین قرار دیا: ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴿۱﴾﴾ (الفتح)۔ یہ فتح مبین مسلمانوں کو ۶ ہجری میں عطا ہوئی جبکہ ظاہری فیصلہ کن فتح انہیں ۸ ہجری میں فتح مکّہ کی صورت میں حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت میں فتح کے ذکر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورۃ الحدید کم از کم ۶ ہجری یعنی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی۔

اب سنیے' کھلے اور بیدار دل کے ساتھ ایک اہم پکار! ذرا دھیان سے سنیے! میرا خالق' آپ کا خالق' میرا مالک' آپ کا مالک اور پوری کائنات کا مالک کیا ندا کر رہا ہے؟

آیت ۱۱ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ’’کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟‘‘

﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ’’کہ وہ اس کے لیے اسے بڑھاتا رہے اور اُس کے لیے بڑا باعزّت اجر ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور بھلا کون اجر دے سکتا ہے؟ ایسا منافع اور بھلا کہاں سے مل سکتا ہے؟ چنانچہ اے اہلِ ایمان! آگے بڑھو! لبیک کہو اپنے رب کی اس پکار پر! اور اپنا مال اور اپنا وقت قربان کر دو اس کی رضا کے لیے! اپنی صلاحیتیں اور اپنی جان کھپا دو اُس کی راہ میں!

یہاں پر یہ نکتہ ایک دفعہ پھر سے ذہن نشین کر لیجیے کہ انفاقِ مال اور انفاقِ جان ایک اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔ مال اور جان کے باہمی تعلق کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ ایک شخص اپنی جان' یعنی جسمانی قوت' ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کی مدد سے مال کماتا ہے۔ پھر اپنے اس مال سے ایک طرف وہ اپنی جان کی بقا کا سامان پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اسی کی مدد سے وہ دوسروں کی قوت' ذہانت اور دیگر صلاحیتوں کو خریدنے کی استعداد بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مہلتِ زندگی یعنی ’’وقت‘‘ بھی اُس کی دولت ہے جس کے ذریعے سے وہ مال کماتا ہے۔ چنانچہ

عام طور پر کہا جاتا ہے: time is money کہ وقت اصل دولت ہے۔ گویا انسان کی جان‘ اُس کا مال اور وقت باہم یوں متعلق و مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے انفاق میں عملی طور پر باقی دو چیزوں کا انفاق بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں جس انفاق کی بات ہو رہی ہے اس میں آپ کا مال‘ آپ کا وقت‘ آپ کی جسمانی قوت‘ ذہانت‘ فطانت‘ جان وغیرہ سب شامل ہیں۔

اب اگلی آیات میں روزِ محشر کے اس مرحلے کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے جب منافقین کو چھانٹ کر سچّے اہلِ ایمان سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس مرحلے کو ہمارے ہاں عموماً ’’پُل صراط‘‘ کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ میدانِ حشر کا یہ نقشہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں مختلف مواقع پر مختلف قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہوتی چلی جائے گی۔ اس چھانٹی کے عمل کو سمجھنے کے لیے بجری بنانے والے کرشرز (crushers) میں لگی چھلنیوں کی مثال ذہن میں رکھیے۔ جس طرح ان مشینوں میں لگی مختلف قسم کی چھلنیاں مختلف سائز کے پتھروں کو الگ کرتی چلی جاتی ہیں بالکل اسی طرح میدانِ محشر میں مختلف مراحل پر مختلف قسم کے انسان بھی اپنے اعتقادات و اعمال کی بنیاد پر الگ ہوتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ سب سے پہلی چھانٹی میں تمام کُفّار و مشرکین کو الگ کر لیا جائے گا۔ پھر کسی مرحلے پر ایمان کے دعوے داروں میں سے سچّے مؤمنین اور منافقین کو الگ الگ کرنے کے لیے چھانٹی کی جائے گی اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کا نقشہ آئندہ آیات میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس چھانٹی کے لیے تمام مسلمانوں کو گھپ اندھیرے میں پُل صراط پر سے گزرنا ہوگا جس کے نیچے جہنّم بھڑک رہی ہوگی۔ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان تھا اور انہوں نے ایمان کی حالت میں نیک اعمال بھی کیے تھے‘ ان کے قلوب اور داہنے ہاتھوں سے اُس وقت نُور پھوٹ رہا ہوگا اور وہ اس روشنی میں راستہ پار کر کے جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ دنیا میں سچّے ایمان سے محروم رہے اور اعمالِ صالحہ کی پونجی بھی ان کے پاس نہیں ہوگی‘ وہ خواہ دنیا میں مسلمانوں ہی کے ساتھ شریک رہے ہوں اور خواہ وہ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین بن کر رہے ہوں اُس وقت وہ روشنی سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اس حالت میں وہ ٹھوکریں کھاتے جہنّم میں گرتے چلے جائیں گے۔ آئندہ آیات میں اس مرحلے کا تفصیلی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بعد روزِ محشر کے اس مرحلے کی ایک جھلک سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی دکھائی گئی ہے۔

❁❁❁

دین میں حدیث وسُنّت کا مقام

عبدالرشید عراقی

حدیث کی تعریف

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ حدیث نبوی ﷺ کا معنی اور مطلب کیا ہے۔ حدیث کے معنی لغت کی کتابوں میں بات چیت اور گفتگو کے آئے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾﴾ (المرسلات)

''اب اس (قرآن) کے بعد یہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟''

شریعتِ اسلامیہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات' افعال اور تقریر کے مجموعے کا نام سُنّت اور حدیث ہے۔ سُنّت کو کبھی حدیث اور حدیث کو کبھی سُنّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمائے اسلام نے سُنّت کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:

اَلسُّنَّۃُ تُطْلَقُ عَلٰی قَوْلِ الرَّسُوْلِ وَفِعْلِہٖ وَسُکُوْتِہٖ وَعَلٰی اَقْوَالِ الصَّحَابَۃِ وَاَفْعَالِھِمْ [1]

''سُنّت کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور سکوت پر نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال وافعال پر ہوتا ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد جگہ پر حدیث کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''النساء ۴:۰ ۱۴' الانعام ۶:۶۸' الاعراف ۷:۱۸۵' الکہف ۱۸:۶' طٰہٰ ۲۰:۹' لقمان ۳۱:۶' الاحزاب ۳۳:۵۳' الزمر ۳۹:۲۳' الجاثیہ ۴۵:۶' الذّاریات ۵۱:۲۴' الطور ۵۲:۳۴' النجم ۵۳:۵۹' الواقعہ ۵۶:۸۱' القلم ۶۸:۴۴' المرسلات ۷۷:۵۰' النازعات ۷۹:۱۵' البروج ۸۵:۱۷' الغاشیہ ۸۸:۱''[2]

قرآن مجید کے لیے ''اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡث'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

﴿اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ﴾ (الزمر:۲۳)

''اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے۔''

آنحضرت ﷺ کو اس دنیا میں مبلغ ومعلم بنا کر بھیجا گیا تھا اور آپ ﷺ کو دینِ الٰہی اور مکمل کتاب (قرآن مجید) عطا کی گئی تھی۔ اس مقدس کتاب کو آپ ﷺ نے لوگوں کو سنایا' سمجھایا' لکھوایا اور اس پر کامل طور پر عمل کر کے دکھایا۔ گویا آپ ﷺ قرآن مجید کی عملی تصویر تھے۔ چنانچہ حدیث کی یہ تعریف کی گئی ہے:

''رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو آپ ﷺ کے سامنے پیش آئے اور اس میں کوئی ردّوبدل نہیں کیا گیا (جسے اصطلاحاً تقریر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے)۔''

ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''شرعی اصطلاح میں حدیث سے مراد وہ اقوال و اعمال و تقریر جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو۔ تقریر سے مراد محدّثین کے ہاں کسی آدمی کا قول یا فعل جو آنحضرت ﷺ کے سامنے لایا گیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کی تصحیح یا تغلیط نہ فرمائی ہو۔ گویا آپ ﷺ کی خاموشی رضامندی ہے۔ یہ بھی حدیث میں داخل ہے۔''(۳)

مولانا عبدالمالک مجاہد حفظہ اللہ' مدیر دارالسلام لکھتے ہیں:

''عربی زبان میں حدیث کا لفظ بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغوی طور پر یہ لفظ گفتگو' نئی بات' قابلِ ذکر واقعہ' نئی چیز یا کلام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب حدیث کا لفظ ایک اصطلاح کے بطور استعمال ہو تو اس سے مراد رسول کریم ﷺ کے اقوال و افعال اور اعمال و احوال ہوتے ہیں' یا یوں کہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی اور رسالت سے متعلق (راویوں' صحابہ کرام اور ان کے فیض یافتگان کے ذریعے سے) جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ حدیث کہلاتا ہے۔ حدیث کو دیگر اصطلاحات میں سُنّت' خبر اور اثر بھی کہتے ہیں۔ اور یہ تمام ذخیرۂ حدیث قولی' فعلی' تقریری نوعیت سے تعلق رکھتا ہے۔''(۴)

امام حدیث مولانا ابوالعلی محمد عبدالرحمٰن بن حافظ عبدالرحیم مبارک پوری رحمہ اللہ (م ۱۳۵۳ھ) نے مقدمہ تحفۃ الاحوذی میں علامہ محمد بن یوسف بن علی الکرمانی (م ۷۸۶ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے:

اعلم ان علم الحدیث موضوعه ذات رسول الله ﷺ من حیث انه رسول الله وحده' هو علم یعرف به اقوال رسول الله ﷺ وافعاله واحواله وغایته هو الفوز بسعادة الدارین(۵)

''علم حدیث کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے' اس حیثیت سے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اس علم کی تعریف یہ ہے جس کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی' آپ کے افعالِ پاکیزہ' اور احوالِ شائستہ معلوم کیے جاتے ہیں اور اس علم کی غرض وغایت دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کرنا ہے۔''

علم حدیث

حدیثِ نبوی ﷺ کا علمائے اسلام کے نزدیک مرتبہ و مقام کیا ہے اور وہ شریعتِ اسلامیہ میں اسے کس درجہ پر رکھتے ہیں' اس بارے میں برصغیر کے نامور علمائے کرام نے اپنی تصانیف میں مقام حدیث پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں چند ایک تحریریں پیش خدمت ہیں۔

(۱) مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (م ۱۳۴۱ھ) لکھتے ہیں:

''علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ آنحضور ﷺ کے اقوال' احوال اور افعال جانے جائیں۔ علمِ حدیث کی اس تعریف سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ فنِ حدیث کا موضوع آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس علم کی غرض وغایت دنیاوی واُخروی سعادت کی تحصیل ہے۔ احکامِ شرعیہ اور فقہیہ میں کتاب اللہ کے بعد حدیث شریف حُجّت ہے۔ اس علم کے اصول واحکام اور اس کے قواعد واصطلاحات کو علماء نے اور محدّثین وفقہاء نے بڑی وضاحت وتفصیل سے بیان فرمایا ہے۔''(۶)

(۲) علامہ سیّد سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) فرماتے ہیں:

''علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اَعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہر آن اُن کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔ آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر' احکام القرآن کی تشریح وتعیین' اجمال کی تفصیل' عموم کی تخصیص' سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حاملِ قرآن محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حیاتِ طیبہ' اخلاق و عاداتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور آپؐ کے سنن ومستحبات اور احکام وارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال واقوال اور اجتہادات واستنباطات کا خزانہ اسی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے موجود وقائم ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ تاقیامت رہے گا۔''(۷)

(۳) مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ (م ۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں:

''کلام مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس میں کوئی غموض وخفا نہیں ہے' لیکن اس میں اسلام کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا' اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت وتشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے فرمائی۔ آپ ﷺ کا کام محض کلامِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا' بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھا۔ نبی ﷺ کی بعثت' اسلام کا ظہور' اس کی تبلیغ' اس راہ کی صعوبتیں' غزوات' اسلام کا غلبہ واقتدار اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام' اس کا نظام' رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخِ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے۔ اس لیے حدیث نبویؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے۔''(۸)

(۴) مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ (م ۱۹۹۹ء) فرماتے ہیں:

''حدیثِ نبویؐ ایک ایسی میزان ہے جس میں ہر دور کے معلّمین ومجدّدین اس اُمّت کے اعمال' عقائد' رجحانات اور خیالات کو تول سکتے ہیں اور اُمّت کے طویل تاریخی عالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات اور انحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے۔ اگر حدیثِ نبویؐ کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل اور کامل ومتوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے اور اگر وہ حکیمانہ تعلیمات نہ ہوتیں جن کی پابندی رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ اُمّت افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ جاتی اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا اور وہ عملی مثال موجود نہ رہتی جس کی اقتداء کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں ترغیب دی ہے:

﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات اُسوہ حسنہ ہے۔''

اور اس کے بعد یہ ارشاد فرما کر آپ ﷺ کے اتباع کی دعوت دی ہے:

﴿قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِيۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۳۱﴾ (آل عمران)

’’آپ (ﷺ) کہہ دیجیے اگر تمہیں اللہ سے محبّت ہے تو میری اتباع کرو' اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا' اور اللہ بہت بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔‘‘

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اور جس سے وہ زندگی اور قوت واعتماد حاصل کر سکتا ہے اور یہ اطمینان کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان بلکہ امر واقعہ ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ زندگی' قوت اور اثر انگیزی سے بھرپور اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کے کام' فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آراء اور برسرِ جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر اُبھارتی رہی ہے۔ اور اس کے اثر سے ہر دور و ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا' کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے' بدعتوں اور خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی' اور دین خالص اور اسلام کی دعوت دی۔ اسی لیے حدیث نبویؐ اُمّتِ اسلامیہ کے لیے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ اس کی حفاظت' ترتیب وتدوین' حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر اُمّت کا یہ دینی اور ذہنی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔(۹)

(۵) شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمہ اللہ (م ۱۹۶۸ء) برصغیر پاک وہند کے نامور عالم دین' خطیب' مقرر' واعظ' مبلّغ' مصنّف' مدرس' ادیب' دانشور' مفکّر' مدبّر' محدّث' مفسّر اور سیاست دان تھے۔ تصنیف وتالیف میں ایک منفرد مقام کے حامل تھے۔ تفسیرِ قرآن کے بعد مولانا سلفی رحمہ اللہ کا پسندیدہ موضوع حجیتِ حدیث' تدوینِ حدیث' مدافعتِ حدیث' خدماتِ محدثین' اور مسلک اہلِ حدیث سے محبّت اور شیفتگی تھی۔ فتنہ انکارِ حدیث کی تردید میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں☆۔

☆ متعلقاتِ حدیث کے بارے میں مولانا سلفی رحمہ اللہ نے درج ذیل مقالات تحریر فرمائے: (۱) حدیث کی تشریعی اہمیت (۲) سُنّت: قرآن کے آئینہ میں (۳) حجیتِ حدیث (۴) حدیث شریف کا مقامِ حُجّت (۵) حدیث علمائے اُمّت کی نظر میں (۶) امام بخاریؒ کا مسلک (۷) جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث (۸) جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور مدیر فاران کراچی (۹) اضاحۃ الحق (۱۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذباتِ ثلاثہ (۱۱) عجمی سازش کا افسانہ (۱۲) عجمی سازش کا تجزیہ: واقعات کی روشنی میں (۱۳) ایک سوال دو جواب (۱۴) امام محمد بن مسلم زہریؒ اور تحریک انکارِ حدیث (۱۵) مولانا تمنّا کے تنقیدی مضامین کا علمی محاسبہ (۱۶) واقعہ افک کے متعلق نئی تمنائی ریسرچ (۱۷) مقدمہ نصرۃ الباری فی بیان صحۃ البخاری (۱۸) مسئلہ درایت وفقہ کا تاریخی وتحقیقی جائزہ (عراقی)

محقق العصر حضرت مولانا ارشاد الحق عصری حفظہ اللہ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے کچھ بندوں کو اس کی توفیق بخشی کہ وہ ان باطل پرستوں کی سرکوبی اور ان کے باطل نظریات کی بیخ کنی کریں۔ انہی خوش نصیبوں میں ایک استاذ العلماء حضرت مولانا محمد اسمٰعیل سلفی رحمہ اللہ تھے جنہوں نے دفاعِ حدیث کا بیڑہ اٹھایا اور اس کا حق ادا کیا۔''(۱۰)

مولانا سلفی رحمہ اللہ اپنے مقالہ ''حدیث کی تشریعی اہمیت'' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''ادلہ شرعیہ کے تذکرہ میں قرآن عزیز کے بعد ائمہ سُنّت علی العموم علوم نبوت کے متعلق چار لفظ ذکر فرماتے ہیں: (۱) خبر (۲) اثر (۳) حدیث (۴) سُنّت

خبر: زبان کے لحاظ سے تو واقعہ کی ہر اطلاع اور تذکرہ کو ''خبر'' کہا جاتا ہے' مگر آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر یہ لفظ بولا جائے تو حدیث کے مترادف ہوگا۔ یعنی ''اخبار الرسول'' احادیثِ نبویؐ کے ہم معنی ہوگا۔

اثر: اثر کسی چیز کے بقیہ اور نشان کو کہتے ہیں:

﴿فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ﴾ (الروم:۵۰)

''پس آپ رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھیں۔''

نقل کو اثر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صحابہؓ اور تابعینؒ سے جو مسائل منقول ہیں انہیں آثار کہا جاتا ہے:

﴿اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ (الاحقاف:۴)

''(اس سے پہلے کی) کوئی کتاب لاؤ یا کوئی علمی نقل''

آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر بھی ''اثر'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور عموماً اس کا استعمال اضافت سے ہوتا ہے۔ جب ''آثار الرسول'' کہا جائے تو یہ حدیث اور سُنّت کے مترادف ہوگا' اور مطلقاً بولا جائے تو آثارِ صحابہؓ مراد ہوں گے یا اس کا لغوی مفہوم۔

حدیث: آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو اور قرآن عزیز کو بھی حدیث کا نام دیا گیا ہے:

﴿اِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ﴾ (التحریم:۳)

''جب آنحضرت (ﷺ) نے اپنی بیویوں سے آہستہ بات کی۔''

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾﴾ (النساء)

''اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہے۔''

سُنّت: اصولِ فقہ کے متون میں بعض علماء نے فرمایا ہے کہ سُنّت کا لفظ صرف آنحضرت ﷺ

کے اعمال پر بولا جاتا ہے اور حدیث کا لفظ اقوال پر' لیکن ادلہ شرعیہ کے تذکرہ میں وہ حدیث اور سُنّت کو مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں۔ سُنّت کا لفظ جب اضافت سے استعمال ہو تو سُنّتِ نبوی سے مراد احادیث ہی لی جاتی ہیں۔''(۱۱)

مسلّم الثبوت میں سُنّت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

ما صدر عن الرسول ﷺ غير القرآن من قول و فعل وتقرير (۱۲)

سُنّت کے لغوی معنی مروّجہ طریقہ کے ہیں' لیکن علمائے اسلام کی اصطلاح میں سُنّت سے رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور دوسروں کے وہ اقوال و افعال مراد ہیں جن سے آپ ﷺ نے سکوت فرمایا اور جن کو قائم و برقرار رکھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال و افعال بھی اس بنیاد پر سُنّت میں داخل ہیں کہ ان کے پاس اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قولی یا فعلی سند موجود ہوگی۔ سُنّت کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور سکوت پر نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال و افعال پر ہوتا ہے۔(۱۳)

سُنّتِ مطہرہ قرآن کی شارح ہے

رسول اکرم ﷺ کا کام محض کلامِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا بلکہ اس کی تشریح و تبیین بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ﴿۴۴﴾﴾ (النحل)

''یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپؐ کی طرف اتارا ہے تاکہ لوگوں کی جانب جو نازل کیا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔''

یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ آپ ﷺ کی ذِمّہ داری یہ ہے کہ قرآن کی آیات کی وضاحت فرما دیں تاکہ لوگ اس میں غور و فکر کر کے ہدایت کی راہ پر گامزن ہوں اور فلاحِ دارین حاصل کریں۔

قرآن مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی کتاب ہے' اس میں کسی قسم کا غموض و خفا نہیں ہے' لیکن اس میں دین اسلام کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت و تشریح اور کلیات سے جزئیات کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے فرمائی۔

قرآن مجید باوجود اپنی جامعیت اور جملہ ضروریہ پر حاوی ہونے کے زیادہ تر ایمان و عقائد

اور اصولِ دین بیان کرتا ہے۔ اس لیے اس کی حیثیت ایک بنیادی قانون اور دستورِ اساسی کی ہے۔ اسے تفصیلی شکل دینا اور اس کی دفعات کی وضاحت کرنا دراصل حدیث کا کام ہے۔

امام اوزاعیؒ نے امام مکحولؒ سے نقل کیا ہے:

الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب(۱۴)

''کتاب اللہ سُنّت کی اس سے کہیں زیادہ محتاج ہے جتنی کہ سُنّت کتاب اللہ کی محتاج ہے۔''

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

فکان السنة بمنزلة التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب(۱۵)

''پس گویا سُنّت کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔''

اگر حدیث کو قرآن سے علیحدہ کر دیا جائے' تو بہت سے احکام مشتبہ رہ جائیں گے اور ان کا سمجھنا اور ان پر عمل کرنا نہایت دشوار ہو جائے گا۔ جس طرح قرآن کے اوامر ونواہی کا ماننا ضروری ہے' اسی طرح حدیث کے اوامر ونواہی کو ماننا بھی ضروری ہے۔ قولِ رسول ﷺ کا نام حدیث اور عمل متواتر کا نام سُنّت ہے۔ اور کلام اللہ کے بعد اسی حدیث وسُنّت کا درجہ ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ (م ۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں:

''درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبویؐ پر قائم ہے۔ وہ کلام اللہ کی تفسیر بھی ہے' اس کے اجمال کی تفصیل بھی' اس کے کلی احکام کے جزئیات کی تفریع اور اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ بھی۔ اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں۔ اسلام کے ارکانِ اربعہ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی معلوم نہیں ہو سکتے ہیں اور نہ ان کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے۔ دین کے صرف کُلّی احکام قرآن مجید میں ہیں' اس کی تفصیل حدیث وسُنّت سے معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال اکثر اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا ہے۔''(۱۶)

مولانا عبدالقیوم ندویؒ لکھتے ہیں:

''حدیث سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اسلامی زندگی کا بقا ایک دن بھی متصور نہیں ہو سکتا ہے۔ وضو اور اس کے مسائل' نماز کی تفصیلات' نماز کی رکعات' اسی طرح حج' زکوٰۃ' روزہ' جہاد اور دیگر اہم ضروری مسائل یا اسلام کی تفصیلات سے ہم کو قطعی طور پر محروم ہونا پڑے گا۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے حدیث سے استغناء کلیتاً ناممکن اور محال ہے۔''(۱۷)

حدیث کے بغیر قرآن مجید کے بعض مقامات کا سمجھنا محال ہے

قرآن مجید میں کئی ایک ایسے مقامات ہیں جن کا حدیث نبوی ﷺ کے بغیر سمجھنا محال ہے۔ ذیل میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے کہ بغیر حدیث کی مدد کے اس کا مفہوم اور مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جاتا ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿٨٧﴾﴾ (الحجر)

''(اے نبی ﷺ!) یقیناً ہم نے آپ کو سات آیات دے رکھی ہیں کہ دہرائی جاتی ہیں اور عظیم قرآن بھی دے رکھا ہے۔''

مفسّرین کرام کے اقوال

اس آیت کے بارے میں مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں۔

(۱) ''سبع مثانی'' سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے جس کی سات آیات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سمیت ہیں۔ ان کے ساتھ اللہ نے تمہیں مخصوص کیا ہے۔ یہ کتاب کا شروع ہیں اور ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں، خواہ فرض نماز ہو، خواہ نفل نماز ہو۔[۱۸]

(۲) نبی کریم ﷺ کو کفّارِ قریش کی اذیتوں پر صبر کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار عظیم نعمتوں سے نواز رکھا ہے، جن میں سب سے بڑی نعمت سورۃ الفاتحہ اور قرآن کریم ہے۔ اس لیے آپؐ دل چھوٹا نہ کیجیے اور پیغام رسانی کے کام میں لگے رہیے، کیونکہ آدمی جب اپنے اوپر اللہ کی عظیم نعمتوں کو یاد کرتا ہے تو دعوت کی راہ میں مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔[۱۹]

(۳) سبع من المثانی: سات دہرائی جانے والی آیات سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: قرآن کی سب سورتوں سے بڑھ کر ہے اور وہ ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہی سبعاً من المثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا۔ (بخاری تفسیر سورۃ الفاتحہ)[۲۰]

(۴) بہت سے مفسرین نے ''سبع مثانی'' سے مراد سورۃ الفاتحہ اور ''قرآن عظیم'' سے مراد باقی قرآن لیا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت میں مذکور سبع مثانی بھی اور قرآن العظیم بھی سورۃ الفاتحہ ہی کو کہا ہے۔ بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں آپ ﷺ کے الفاظ ہیں: ((اُمُّ الْقُرآن ھی السَّبع المثانی وَالقُرآن العظیم))

''اُمّ القرآن ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔'' (۲۱)

(۵) سبع مثانی کیا ہے؟ حدیث نے اس کی وضاحت کی ہے کہ سبع مثانی سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ سات آیات ہیں جو ہر نماز میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے' جو مجھے دیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری تفسیر سورۃ الفاتحہ) (۲۲)

(۶) مولانا ابوالکلام آزادؒ (م ۱۹۵۸ء) فرماتے ہیں:

''اور بلاشبہ ہم نے تمہیں دہرائی جانے والی آیتوں میں سے سات آیتوں کی سورت عطا فرمائی ہے (یعنی سورۃ الفاتحہ) اور قرآن عظیم' اور اس کا دہرا دہرا کر ہر نماز میں پڑھنا تمہارے لیے کفایت کرتا ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ یہاں سبعًا من المثانی سے مقصود سورۂ فاتحہ ہے۔'' (۲۳)

(۷) مولانا سیّد مودودی رحمہ اللہ (م ۱۹۷۹ء) سورۃ الحجر کی آیت ۸۷ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

''ہم نے تم کو سات آیتیں دے رکھی ہیں' یہ بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے۔''

اور اس کی تفسیر میں سیّد مودودی لکھتے ہیں:

''یعنی سورۂ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد سات بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو سو آیتیں ہیں' یعنی البقرۃ' آلِ عمران' النساء' المائدۃ' الانعام' الاعراف اور یونس یا انفال یا توبہ' لیکن سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورۂ فاتحہ مراد ہے' بلکہ امام بخاریؒ نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی کریم ﷺ نے سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ لی ہے۔'' (۲۴)

اطاعتِ رسول ﷺ کا حکمِ الٰہی

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے اور بہت سی آیات میں ''اَطِیۡعُوا اللّٰہَ'' کے ساتھ ساتھ ''اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ'' کے الفاظ آئے ہیں:

(۱) ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ (آل عمران)

''اور اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

(۲) سورۃ النساء میں فرمایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اُس نے اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی۔''

(۳) ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ)) (۲۵)

''جس نے میری اطاعت کی' اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔''

یہی وجہ ہے کہ دورِ رسالت میں بھی اور اس کے بعد بھی نبی کریم ﷺ کے قول وفعل کو اسی طرح واجب الاطاعت سمجھا گیا جس طرح کتاب اللہ کو' اور دونوں (قرآن اور سُنّت وحدیث) کو وحی الٰہی تسلیم کیا گیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۴﴾ (النجم)

''اور نہ اپنی خواہش نفس سے کوئی بات کہتے ہیں۔ وہ تو صرف وحی ہے جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

اس لیے آپ ﷺ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں۔

مولانا بدرِ عالم میرٹھی (م ۱۹۶۵ء) حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (م ۷۶۱ھ) کی کتاب ''اعلام الموقعین عن ربّ العالمین'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اگر رسول (ﷺ) کی اطاعت صرف ان احکام تک محدود رہے جو قرآن مجید میں صاف صاف موجود ہیں تو پھر ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ کی آیت کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا' جب کہ یہ آیت یہ چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسول ﷺ کی اطاعت بھی ایک مستقل مد ہے۔ بیسیوں آیات میں اطاعتِ رسول کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اُس ؐ کی براہِ راست اطاعت کرنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ایک حکم ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی نہیں کرتا۔''(۲۶)

حدیث کی تشریعی حیثیت

علمائے اسلام کے نزدیک حدیث کی تشریعی حیثیت مسلّم ہے' کیونکہ احادیث کا تمام ذخیرہ

قرآن مجید کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ اگر قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی حیثیت بھی تشریعی ہونی چاہیے۔ یہی عقیدہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور علمائے اسلام کا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ صحابہ کرامؓ نے حدیث کو تاریخی حیثیت دی ہو۔ حدیث کی تشریعی حیثیت کے بے شمار واقعات حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے متعلق ہوا۔ کیا اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ اُس حدیث کے سوا جو اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھ کر سنائی، کسی اور دلیل سے کیا گیا تھا؟ کیا تاریخ سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کوئی آواز بھی اس حدیث کے خلاف اٹھائی گئی ہو؟ سب نے اس کو تسلیم کیا اور اسی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی۔ حضرت ابوبکر صِدِّیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نبی کا بھی انتقال ہوا اس کو اُسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس کا انتقال ہوا تھا۔(۲۷)

ایک اور واقعہ بھی حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ حضرت ابوبکر صِدِّیق رضی اللہ عنہ سے ایک عورت نے ان کے عہدِ خلافت میں اپنے پوتے کے ترکہ میں اپنے حصّہ کا مطالبہ کیا تھا۔ آپؓ نے اُس عورت سے فرمایا: ''مَیں تیرا حصّہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا''۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دادی کو ۶/۱ حصّہ دلوایا تھا۔ حضرت ابوبکر صِدِّیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے شہادت طلب کی تو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مَیں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دادی کو پوتے کی وراثت سے ۶/۱ حصّہ دلوایا تھا۔ چنانچہ حضرت صِدِّیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر فیصلہ کر دیا۔(۲۸)

حافظ ابن عبدالبر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں امام زہری (تابعی) کا یہ قول نقل کیا ہے: الاعتصام بالسنن نجاۃ ''سُنّت پر عمل کرنا نجات ہے۔''

مولانا عبدالغفار حسن عمرپوریؒ (م ۲۰۰۷ء) لکھتے ہیں:

''قابل اعتماد روایات اور مستند اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ معتزلہ اور خوارج میں سے چند افراد کے سوا پوری اُمّت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد اسلامی قانون کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث ہیں۔''(۲۹)

حُجیّتِ حدیث

منکرینِ حدیث ’’حدیث‘‘ کو حُجت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہمیں قرآن ہی کافی ہے۔ حالانکہ ان کا یہ موقف سراسر باطل ہے اور ان کی جاہلیت و کم علمی کا واضح ثبوت ہے۔ حدیثِ نبویؐ بھی دین اسلام میں حُجّت ہے۔ علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سے کسی حدیث کا صادر ہونا ثابت ہو جائے تو اُس کے حُجّت ہونے میں کوئی شبہ نہیں‘ کیونکہ سند کی صحت کے بعد اگر حدیث کو حُجت نہ مانا جائے تو اس سے پورے دین کا انکار لازم آ جائے گا۔ (۳۰)

آنحضرت ﷺ کے ذمہ صرف قرآن مجید کی تلاوت و تبلیغ نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کی تعلیم اور تزکیہ بھی تھا۔ اور آپ ﷺ کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ یہ حکمت اگرچہ قرآن اور وحی الٰہی سے ماخوذ ہے مگر اس سے الگ چیز ہے۔

’’کتاب‘‘ سے مراد قرآن مجید ہے اور ’’حکمت‘‘ کا لفظ سارے قرآن میں تقریباً بیس مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس کے معنی دانائی‘ بصیرت‘ قرآن فہمی‘ دین کی سمجھ اور ہر عمدہ کام کے آتے ہیں۔ جس حکمت کی تعلیم آنحضرت ﷺ نے دی ہے اس کی نظیر دنیا میں موجود نہیں ہے اور اس حکمت سے مراد مفسّرین کرام و ائمہ عظام کی تصریح کے مطابق ’’سُنّت‘‘ ہے۔

حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) نے حکمت کے معنی ’’سُنّت‘‘ کیے ہیں: الحکمة یعنی السنة کہ حکمت سے مراد ’’سُنّت‘‘ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر‘ سورة البقرة‘ آیت ۱۲۹)۔ چنانچہ جس طرح کتاب اللہ کے احکام و ارشادات پر عمل کرنا فرض ہے اسی طرح احادیث میں جو احکام و ارشادات رسول اللہ ﷺ نے فرمائے ہیں ان پر بھی عمل کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح الفاظ میں حکم فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

’’یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی ذات گرامی بہترین نمونہ ہے۔‘‘

اصلِ دین آمد کلام اللہ معظّم داشتن
پس حدیثِ مصطفیؐ بر جاں مسلّم داشتن

قرآن مجید کی اصل حیثیت متن کی ہے اور حدیث اس کی شرح و تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے کبھی بھی قرآن مجید کو حدیث سے آزاد ہو کر نہیں دیکھا۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ

(سابق مفتی اعظم سعودی عرب) فرماتے ہیں:

''اگر ہم یہ نظریہ قائم کر لیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث غیر محفوظ ہے یا یہ کہ وہ قابلِ حُجّت نہیں ہے تو اللہ کے فرمان ﴿اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ اور کسی معاملہ میں تنازع کے وقت ﴿فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ پر عمل کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایک ایسی چیز کا مکلّف کیا ہے جس کا سرے سے ہی وجود نہیں ہے اور یہ نہایت کفر اور اللہ کے ساتھ سوئے ظن ہے۔''(۳۱)

ایک دوسرے موقع پر شیخ ابن باز ؒ فرماتے ہیں:

''یہ دونوں اصل (قرآن وسُنّت) آپس میں لازم وملزوم ہیں' ایک کا انکار وتکذیب دوسرے کے انکار وتکذیب کو مستلزم ہے' جس کا مرتکب اہلِ علم وایمان کے نزدیک کافر' گمراہ اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔''(۳۲)

تدوینِ حدیث

اہلِ اسلام نے جتنا اہتمام آنحضرت ﷺ کے کلام کی حفاظت کے لیے کیا ہے آج تک روئے زمین پر کسی دوسری قوم نے اپنے پیشوا کے کلام کی حفاظت کے لیے نہیں کیا۔ اپنے پیشوا کے کلام کی حفاظت تو دور کی بات ہے وہ تو اپنے نبیؑ پر نازل کردہ کتاب کی حفاظت نہ کر سکے۔ لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے جاں نثاروں نے آپ ﷺ کے اقوال ہی نہیں' بلکہ افعال بھی حتیٰ کہ ہر حرکت وسکون' اندازِ گفتگو اور طرزِ تکلّم کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ اس سے زیادہ حفاظت تصوّر میں نہیں آسکتی۔

منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ اعتراض عام کیا جاتا ہے کہ تدوینِ حدیث کا کام زمانہ نبوی ﷺ کے ۱۵۰ سال بعد شروع ہوا۔ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں کئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کر لیے تھے۔

علامہ سیّد سلیمان ندویؒ اپنے ایک مکتوب بنام مولانا عبدالماجد دریابادیؒ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے اس فقرے کا معنی کہ حدیث کی تدوین ہجرت کے ڈیڑھ سو برس بعد ہوئی ہے' یہ ہے کہ تصنیف اور کتاب کی حیثیت میں' ورنہ محض تحریر وکتابت کی حیثیت سے زمانہ نبویؐ میں ان کی جمع وتحریر کا آغاز ہو چکا تھا۔''(۳۳)

مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ مصنف ''اسلام کا سیاسی نظام'' وسابق استاذِ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ

اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''تحقیق یہ ہے کہ تدوینِ حدیث کا کام خود نبی اکرمﷺ کے زمانہ سے شروع ہو چکا تھا۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔''(۳۴)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ۹۹ھ میں منصبِ خلافت پر فائز ہوئے جن کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ روافض' خوارج اور قدریہ وغیرہ نئے نئے فرقے سر اٹھا رہے ہیں' جو دین اسلام کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں' اس لیے حدیث وسُنّت کی باقاعدہ تدوین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے قاضی ابوبکر بن حزم انصاری رحمہ اللہ (م ۱۲۰ھ) جو کہ بہت بلند پایہ محدّث تھے' اُس وقت مدینہ کے گورنر تھے' ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجّہ دلائی اور ان کو لکھا:

انظر ما كان من حديث رسول اللهِ ﷺ فاكتبه' فانى خِفتُ دروس العلم وذهاب العلماء ولا يقبل الا حديث النبیﷺ (۳۵)

''احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے ان کو تحریر کر لو' کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف محسوس ہوتا ہے' اور صرف رسول اللہﷺ کی احادیث قبول کی جائیں۔''

تدوینِ حدیث کا کام عہد صحابہ کرامؓ میں شروع ہو چکا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اسے آگے بڑھایا اور انہوں نے اپنی حکومت کے گورنروں کے نام سرکلر جاری کیا۔ چنانچہ حافظ ابونعیم اصبہانی اپنی ''تاریخ اصبہان'' میں لکھتے ہیں:

كتب عمر بن عبد العزيز الى الآفاق انظروا حديث رسول اللهِ ﷺ فاجمعوه

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دُور دُور ملکوں میں یہ حکم بھیجا کہ رسول اللہﷺ کی حدیثوں کو تلاش کر کے جمع کرو۔''(۳۶)

چنانچہ ہر صوبہ کے گورنر نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس فرمان کی تعمیل کی۔ حافظ ابن عبدالبر قرطبیؒ اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں لکھتے ہیں:

''سعد بن ابراہیم سے روایت ہے کہ ہم کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمع حدیث کا حکم دیا اور ہم نے دفتر کی دفتر حدیثیں لکھیں اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ حدیث ہر جگہ جہاں ان کی حکومت تھی' بھیجا۔''(۳۷)

مولانا عبدالسلام ندویؒ لکھتے ہیں:

''صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں فن حدیث مدوّن ہو چکا تھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہی اجزائے پریشان کو ایک مجموعے کی صورت میں جمع کیا۔''(۳۸)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا یہ کارنامہ تاریخ حدیث میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا کہ اُس وقت کے علمائے کرام نے آپ کے حکم کی تعمیل کر کے حدیث نبوی ﷺ کو (جو مسلمانوں کا عظیم سرمایہ ہے) محفوظ کر دیا۔

کتابتِ حدیث

منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیث کی کتابت سے منع فرمایا تھا' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر ضرور منع فرمایا تھا' لیکن بعد میں اس کی اجازت دے دی۔ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں مکتوباتِ نبوی' معاہداتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' مسائل نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ و صدقات وغیرہ لکھے جاتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلام کے اساسی احکام پر مشتمل تھا۔ اس بارے میں ایک صحابی ابوشاہ یمنی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے یہ خطبہ لکھوا کر دے دیا جائے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا: ((اُكْتُبُوْا لِاَبِي شَاه)) ''ابوشاہ کے لیے یہ خطبہ لکھ کر اس کے حوالہ کرو۔'' آپ ﷺ کے اس حکم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عہدِ رسالت میں گوناگوں مسائل کو تحریری شکل میں لایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں حجۃ الوداع کے موقع پر ہی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))(۳۹) یعنی جو لوگ اِس وقت موجود ہیں وہ ان لوگوں تک احکام پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ اسی کا نام روایت حدیث ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ (م ۱۹۷۴ء) سابق ایڈیٹر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ لکھتے ہیں:

''اس لیے عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبوی کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ پوری حدیثیں دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں۔ محدثین کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اس زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سقر سمجھا جاتا تھا' اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے' تعلیم بھی محدود تھی' دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سُنّت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتّب کیا اور ان کے ردّ و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور

رواۃ کی جرح وتعدیل کے اصول بنائے‘ اصولِ حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا‘ نیز راویانِ حدیث کے حالات نہایت صحت وتحقیق کے ساتھ قلمبند کیے‘ جو مسلمانوں کا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔‘‘(۴۰)

عہد نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کے تحریری مجموعے

عہدِ نبوی ﷺ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے احادیث کے جو تحریری مجموعے مرتب فرمائے ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) صحیفہ صادقہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے مرتّب فرمایا تھا۔ اس بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے: ’’مجھے زندگی کی چاہت صرف اس صحیفہ صادقہ کی وجہ سے ہے۔‘‘

(۲) کتاب عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ: آنحضرت ﷺ نے ان کے ذریعہ سنن وفرائض کے کچھ مسائل لکھ کر اہلِ یمن کے پاس بھیجے تھے۔

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے صحیفے۔

(۴) صحیفہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

(۵) صحیفہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ

(۶) خطبہ حجۃ الوداع

(۷) کتاب الصدقہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایّام میں زکوٰۃ کے موضوع پر ایک کتاب لکھوائی تھی جو مکمل ہو چکی تھی‘ لیکن آپ ﷺ کی رحلت کی وجہ سے کتاب عاملوں کے پاس بھیجی نہ جا سکی۔ حافظ ابن عبدالبر قرطبیؒ فرماتے ہیں:

’’حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے زمانہ خلافت میں اس کتاب پر عمل کیا۔‘‘(۴۱)

(۸) صحیفہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

(۹) مسند ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

(۱۰) صحیفہ ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۱۱) صحیفہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ

(۱۲) صحیفہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

(۱۳) صحیفہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

(۱۴) صحیفہ عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ

(۱۵) صحیفہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا

(۱۶) صحیفہ محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ

تابعین عظام رحمہم اللہ نے بھی حدیث کے مجموعے مرتّب فرمائے تھے۔ حضرت جابر بن

عبداللہ رضی اللہ عنہ کے دو تلامذہ وہب بن منبہ اور سلمان بن قیس رحمہما اللہ نے حدیث کے مجموعے مرتب فرمائے تھے۔(۴۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تلمیذ رشید حضرت ہمام بن منبہؒ نے حدیث کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا تھا' جو صحیفہ ''ہمام بن منبہ'' کے نام سے معروف ہوا۔ اور یہ صحیفہ مسند امام احمد بن حنبلؒ جلد ۲' ص ۳۱۲ تا ۳۱۸ مکمل درج ہے۔ احادیث کی تعداد ۱۳۸ ہے۔

صحیفہ ہمام بن منبہ علیحدہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی رحمہ اللہ کی تحقیق وتخریج سے شائع ہو چکا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

محدّثین کرام کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے احادیث کی جمع وتدوین میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور ان کی یہ خدمات ان شاءاللہ العزیز ان کے لیے ذریعہ نجات ہوں گی۔

حواشی

(۱) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر' ص ۹۴۔ (۲) کلید القرآن' ص ۳۴۵۔

(۳) علوم الحدیث' ص ۲۴۔

(۴) سنن ابی داؤد مترجم' مطبوعہ دار السلام' ج۱' ص ۳۲۔

(۵) صحیح البخاری مترجم' نعمانی کتب خانہ لاہور' ج ۱' ص ۴۹

(۶) اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں' ص ۱۹۰۔

(۷) مقدمہ تدوین حدیث' مولانا مناظر احسن گیلانی

(۸) مقدمہ تذکرۃ المحدثین' مولانا ضیاء الدین اصلاحی

(۹) تاریخ دعوت وعزیمت' ج ۵' ص ۱۷۰

(۱۰) مقالاتِ حدیث' ص ۳۰ (۱۱) مقالات حدیث' ص ۷۸ تا ۸۱

(۱۲) شرح مسلم الثبوت بحر العلوم' ص ۳۸۶۔ مقالات حدیث' ص ۸۲

(۱۳) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر' ص ۹۸ (۱۴) جامع بیان العلم وفضلہ' ج ۲' ص ۱۹

(۱۵) ترغیب وترہیب مترجم طبع دہلی' ج ۱' ص ۹۶

(۱۶) مقدمہ تذکرۃ المحدثین' مولانا ضیاء الدین اصلاحی' ج ۱' ص ۶

(۱۷) فہم حدیث' ص ۵۰

(۱۸) تفسیر ابن کثیر مترجم' نعمانی کتب خانہ لاہور' ج ۳' ص ۱۴۱

(۱۹) تیسیر الرحمن لبیان القرآن' ڈاکٹر محمد لقمان سلفی' مطبوعہ الریاض سعودی عرب' ص ۴۵۲
(۲۰) تیسیر القرآن از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی' ج ۲' ص ۵۰۰
(۲۱) تیسیر القرآن الکریم' مولانا عبدالسلام بن محمد بھٹوی' ج ۲' ص ۳۴۷
(۲۲) احسن البیان از حافظ صلاح الدین یوسفؒ ' ص ۴۲۷
(۲۳) ترجمان القرآن' ج ۲' ص ۳۰۵' ۳۰۶
(۲۴) تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۵۱۷
(۲۵) صحیح مسلم
(۲۶) ترجمان السنۃ' ج ۱' ص ۱۴۷
(۲۷) نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' ص ۵۴۹
(۲۸) ترجمان السنۃ' ج ۱' ص ۱۳۵
(۲۹) عظمت حدیث' ص ۲۸۲
(۳۰) ہفت روزہ الاعتصام لاہور ۲۹/۱ اکتوبر ۱۹۹۹ء
(۳۱) وجوب العمل بسنة رسول الله ﷺ
(۳۲) وجوب العمل بسنة رسول الله ﷺ
(۳۳) مکتوبات سلیمانی' ص ۱۱۲' مکتوب نمبر ۸۱
(۳۴) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ' ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ' ص ۳۷
(۳۵) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب کیف یقبض العلم
(۳۶) مقدمة التعلیق الممجد مولانا عبدالحیؒ' ص ۱۴
(۳۷) جامع بیان العلم بحوالہ سیرت عمر بن عبدالعزیز از مولانا عبدالسلام ندوی' ص ۱۴۱
(۳۸) اسوۂ صحابہ رضی اللہ عنہم' ج ۲' ص ۲۱۰
(۳۹) صحیح بخاری و مسلم
(۴۰) مقدمہ تذکرۃ المحدثین از مولانا ضیاء الدین اصلاحی' ج ۱' ص ۱۸
(۴۱) جامع بیان العلم' ج ۱' ص ۱۷۱
(۴۲) تدوین حدیث از مولانا مناظر احسن گیلانی' ص ۱۸

❁❁❁

دُعا: عبادت کا مغز

احمد علی محمودی

دُعا کے لغوی معنی ہیں پکارنا اور بلانا۔ شریعت کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے حضور التجا اور درخواست کرنے کو دُعا کہتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ مشکلات اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے' جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ﴾ (الزمر: ۸) ''جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو پکارتا ہے اور دل سے اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔'' حضور اکرم ﷺ نے دُعا کو عبادت کی روح اور اس کا مغز قرار دیا ہے۔ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (ترمذی' باب ماجاء فی فضل الدُعاء) حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ''دُعا عین عبادت ہے۔'' (ترمذی۔ باب ماجاء فی فضل الدُعاء)

حاجت روائی کا عظیم دروازہ

دُعا ہی وہ عظیم دروازہ ہے جہاں سے لوگوں اور تمام مخلوقات کی مشکل کشائی اور حاجت روائی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوقات کی ضروریات لاتعداد ہیں اور انہیں جاننے والی صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے جو خالق وقادر اور علیم ورحیم ہے۔ وہی سب کی ضروریات کو پوری کر سکتا ہے۔ وہی ہر امیدوار کی اُمیدیں پوری کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اُس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی' اور نہ ہی اس کے خزانے کبھی ختم ہو سکتے ہیں' جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (المنافقون: ۷) ''آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے۔'' پھر فرمایا: ﴿اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾﴾ (صٓ) ''یہ ہماری عنایت ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔''

ہمارا ربّ تمام عیوب سے پاک ہے۔ وہ یکتا ہے' اور تمام خوبیوں کا مالک ہے۔ اُس کے

علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ بیک وقت سب کی پکار سنتا اور سب کی حاجات پوری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں کچھ یوں ارشاد فرمایا: ﴿یَسۡئَلُہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ﴿۲۹﴾﴾ (الرحمٰن) ''آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق بھی موجود ہے سب اُسی سے (اپنی حاجات) مانگتے ہیں۔ وہ ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔''

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر دن کسی نہ کسی کام میں ہوتا ہے کہ کسی کے گناہوں کو معاف کر دیا تو کسی کی مشکل کشائی کر دی، یا دُعا قبول کی اور قوموں کو ترقی یا تنزلی سے دوچار کر دیا۔'' اسے بزار نے روایت کیا ہے۔

خلیفہ دوم امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مجھے دُعا کی قبولیت کی فکر نہیں ہوتی۔ میرا کام صرف مانگنا ہے، اگر تمہیں مانگنا آ گیا تو سمجھو دُعا قبول ہوگئی۔''

دُعا میں پوشیدہ خیر و برکات

تمام خیر و برکات دُعا میں پوشیدہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ سے زیادہ دُعا مانگیں کہ اِس سے اُس کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ دُعا کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ ہدایت دی ہے، جس سے دُعا کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ (البقرۃ) ''اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) مَیں تو (تمہارے بہت ہی) قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو مَیں اس کی دُعا قبول کرتا ہوں، تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستہ پائیں۔''

دُعا کی عظمت

اللہ کے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دُعا کی عظمت، اس کی برکتیں، اس کے آداب اور دُعا کرنے کے بارے میں واضح ہدایات دی ہیں۔ ایسی بے شمار احادیث ہیں جن میں دُعا کا ذکر ہے اور اس کی اہمیت و فضیلت کو واضح کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''دُعا کارآمد اور نفع بخش ہوتی ہے ان حوادث میں بھی جو نازل ہو چکے ہیں اور ان میں بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئے۔ پس اے خدا کے بندو! دُعا کا اہتمام

کرو۔‘‘(جامع ترمذی)

ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے ارشادفرمایا: ’’اللہ سے اُس کا فضل مانگو‘ کیونکہ اللہ کو یہ بات محبوب ہے کہ اُس کے بندے اُس سے دُعا مانگیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے اُمید رکھتے ہوئے اس بات کا انتظار کرنا کہ وہ بلا اور پریشانی کو اپنے کرم سے دور فرمادے گا‘ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔‘‘(جامع ترمذی)

دُعا کی ضرورت

ہر شخص محتاج ہے اور زمین وآسمان کے سارے خزانے اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہی سائلوں کو عطا کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ﴾ (محمد:۳۸) ’’اللہ بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو۔‘‘ انسان کی محتاجی اور فقیری کا تقاضا یہی ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ سے اپنی حاجت وضرورت کو مانگے اور اپنے کسی بھی عمل کے ذریعہ اللہ سے بے نیازی کا شائبہ بھی نہ ہونے دے‘ کیونکہ یہ مقامِ عبدیت اور دُعا کے منافی ہے۔

دُعا کی اہمیت

اس حوالے سے صرف یہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں اپنے بندوں کو نہ صرف دُعا مانگنے کی تعلیم دی ہے بلکہ دُعا مانگنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (غافر:۶۰) ’’تمہارے پروردگار نے کہا کہ تم مجھ سے دُعا کرو‘ مَیں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔‘‘ غرضیکہ دُعا قبول کرنے والا خود ضمانت دے رہا ہے کہ دُعا قبول کی جاتی ہے‘ اس سے بڑھ کر دُعا کی اہمیت کیا ہوسکتی ہے!

حضور اکرمﷺ نے بھی نہ صرف اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کی ترغیب دی ہے بلکہ اس کے فضائل اور آداب بھی بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشادفرمایا: ’’اللہ کے یہاں دُعا سے زیادہ کوئی عمل عزیز نہیں ہے۔ یعنی انسانوں کے اعمال میں دُعا ہی میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کو کھینچنے کی سب سے زیادہ طاقت ہے۔‘‘

(ابن ماجہ‘ باب فضل الدُعاء)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمﷺ نے ارشادفرمایا: ’’تم میں سے جس کے لیے دُعا کا دروازہ کھل گیا‘ اُس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ کو سب

سے زیادہ محبوب یہ ہے کہ بندہ اس سے عافیت کی دُعا کرے۔‘‘ (ترمذی)

حضورِ اکرم ﷺ نے دُعا کو مؤمن کا خاص ہتھیار یعنی اس کی طاقت بتایا ہے: ((اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ)) (رواہ ابویعلیٰ وغیرہ)۔ یہ تشبیہ دینے کی خاص حکمت یہی ہو سکتی ہے کہ جس طرح ہتھیار دشمن کے حملہ وغیرہ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے‘ اسی طرح دُعا بھی آفات سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پروردگار میں بدرجہ غایت حیا اور کرم کی صفت ہے‘ جب بندہ اُس کے آگے مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اُس کو حیا آتی ہے کہ ان کو خالی ہاتھ واپس کر دے‘ یعنی کچھ نہ کچھ عطا فرمانے کا فیصلہ ضرور فرماتا ہے۔ (سنن ابی داؤد) حضورِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد درحقیقت سائل کے لیے اُمید کی کرن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے جو مانگنے والوں کو کبھی محروم نہیں کرتا اور بندہ کی مصلحت کے مطابق ضرور عطا کرتا ہے۔

دُعا نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی

قرآن وحدیث سے جہاں دُعا کی اہمیت وفضیلت اور پسندیدگی معلوم ہوتی ہے‘ وہیں احادیث میں دُعا نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی بھی وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’جو بندہ اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔‘‘ (ترمذی‘ باب ماجاء فی فضل الدُعاء) دنیا میں ایسا کوئی نہیں جو سوال نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہو‘ حتیٰ کہ والدین بھی اولاد کے ہر وقت مانگنے اور سوال کرنے سے بسا اوقات ناراض ہو جاتے ہیں‘ مگر اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ جو بندہ اُس سے نہ مانگے وہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا نہ کرنا تکبر کی علامت ہے جبکہ مانگنے پر اُسے پیار آتا ہے۔

دُعا کے چند اہم آداب

دُعا چونکہ ایک اہم عبادت ہے‘ اس لیے اس کے آداب بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اس بارے میں کچھ ہدایات دی ہیں‘ دُعا کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا خیال رکھے۔

(۱) اللہ تعالیٰ سے اخلاص کے ساتھ دُعا کرنا‘ یعنی یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہماری ضرورتوں کو پوری کرنے والا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (المؤمن: ۱۴) ’’تم لوگ اللہ کو اُس کے لیے دین کو خالص کر کے پکارو!‘‘

(۲) دُعا کے قبول ہونے کی پوری اُمید رکھنا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اللہ سے اس

طرح دُعا کرو کہ تمہیں قبولیت کا یقین ہو۔'' (ترمذی)

(۳) دُعا کے وقت دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف حاضر اور متوجّہ رکھنا۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک! اللہ تعالیٰ اس بندہ کی دُعا قبول نہیں کرتا جو صرف اوپرے دل سے اور توجّہ کے بغیر دُعا کرتا ہے۔'' (ترمذی) دُعا کے وقت جس قدر ممکن ہو' حضورِ قلب کی کوشش کرے اور رِقّت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجّہ ہو۔

(۴) دُعا کرنے والے کی غذا اور لباس حلال کمائی سے ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک شخص دور دراز کا سفر کرے اور نہایت پریشانی و پراگندگی کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر یارب یارب کہتے ہوئے دُعا کرے جب کہ اُس کی غذا اور لباس سب حرام سے ہو اور حرام کمائی ہی استعمال کرتا ہو تو اُس کی دُعا کیسے قبول ہو سکتی ہے؟'' (صحیح مسلم)

(۵) دُعا کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی دُعا مانگے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے' پھر مجھ پر درود بھیجے' اور پھر جو چاہے مانگے۔ (ترمذی) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دُعا آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے یعنی درجۂ قبولیت کو نہیں پہنچتی جب تک کہ رسول اللہ ﷺ پر درود نہ بھیجا جائے۔ (ترمذی)

(۶) دُعا کے وقت گناہ کا اقرار کرنا' یعنی پہلے گناہ سے باہر نکلنا' اس پر اظہارِ ندامت کرنا اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا۔

(۷) دُعا آہستہ اور پست آواز سے کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ﴾ (الاعراف:۵۵) ''تم لوگ اپنے پروردگار سے دُعا کیا کرو گڑ گڑا کر اور آہستہ آہستہ''۔ (البتہ اجتماعی دُعا تھوڑی بلند آواز کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔)

دُعا کے چند اہم مستحبات

دُعا سے پہلے کوئی نیک کام مثلاً نماز' روزہ اور صدقہ وغیرہ کا اہتمام کرنا۔ قبلہ کی طرف رُخ کر کے دوزانو ہو کر بیٹھنا اور دونوں ہاتھوں کا مونڈھوں تک اس طرح اُٹھانا کہ ہاتھ ملے رہیں اور انگلیاں بھی ملی ہوئیں اور قبلہ کی طرف ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ عالیہ کا ذکر کر کے دُعا کرنا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ دُعا دل سے نکلے۔ دُعا میں اپنے خالق و مالک کے سامنے گڑگڑانا'

یعنی رو رو کر دُعائیں مانگنا یا کم از کم رونے جیسی صورت بنانا۔ دُعا کو بار بار مانگنا۔ دُعا کے وہ الفاظ اختیار کرنا جو قرآن کریم میں آئے ہیں یا جو حضور اکرم ﷺ سے منقول ہیں۔ تمام چھوٹی اور بڑی حاجتیں اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا۔ نماز بالخصوص فرض نماز کے بعد دُعا مانگنا۔ دُعا کرانے والے اور دُعا کرنے والے کا دُعا کے بعد آمین کہنا' اور آخر میں دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر لینا۔

منہیات و مکروہاتِ دُعا

دُعا کے وقت اسباب کی طرف نظر نہ ہو' بلکہ اسباب و تدابیر سے قطع تعلق ہو کر مسبّب الاسباب کی ذات پر یقین رکھنا۔ دُعا میں حد سے تجاوز کرنا غلط ہے' یعنی کسی ایسے امر کی دُعا نہ کرنا جو شرعاً یا عادۃً محال ہو یا جو بات پہلے ہی طے ہو چکی ہو۔ مثلاً یوں نہ کہے کہ فلاں مُردہ کو زندہ کر دے یا عورت یہ دُعا کرے کہ مجھے مَرد بنا دے۔ ایسی دُعا ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی جان' مال اور اولاد کے لیے بددُعا نہ کرے۔ ممکن ہے کہ قبولیت کی ساعت میں یہ بددُعا نکلے اور بعد قبولیت پشیمانی اٹھانی پڑے۔ دُعا کی عدم قبولیت پر مایوس ہو کر دُعا کرنا نہ چھوڑنا' بلکہ حتی الامکان پُرامید رہنا اور دُعا قبول ہو یا نہ ہو' اپنے مالک کے روبرو ہاتھ پھیلاتے رہنا۔ عجب نہیں کہ کس وقت اور کس گھڑی دُعا قبول ہو جائے۔

مخصوص اوقات اور مقامات

دُعا اللہ اور بندے کے درمیان ایک ایسا مخصوص تعلق اور براہ راست رابطہ ہے جس میں بندہ اپنے دل کا حال سیدھے سادھے طریقے سے بیان کرتا ہے۔ بندہ اپنے پروردگار سے دن یا رات کے کسی بھی حصے میں دعا مانگ سکتا ہے' کوئی خاص وقت اس مقصد کے لیے مقرر نہیں۔ تاہم احادیث مبارکہ سے دُعا کے لیے درج ذیل خاص اوقات ثابت ہیں' ان وقتوں میں دُعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں: (۱) رات کا آخری حصہ (یعنی پچھلی شب بیدار ہو کر نماز تہجد پڑھنے کے بعد کی دُعا۔ (۲) جمعہ کے دن میں بھی ایک قبولیت کی ساعت (گھڑی) ہے' اس میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ اس گھڑی کے تعیین میں روایات اور علماء کے اقوال مختلف ہیں' تاہم دو وقتوں کی ترجیح ثابت ہے۔ اوّل: امام کے خطبہ کے لیے ممبر پر جانے سے نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے تک (مسلم)' خاص طور پر دونوں خطبوں کے درمیان کا وقت۔ دوسرا: جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک۔ (ترمذی) (۳) شب قدر میں مانگی جانے والی دُعا۔ (۴) اذان و اقامت کے درمیان کی

دُعا۔(ترمذی)(۵)فرض نمازوں کے بعد کی دُعا۔(۶) سجدے کی حالت میں مانگی جانے والی دُعا۔(۷)قرآن مجید کی تلاوت اور ختم قرآن کے وقت مانگی جانے والی دُعا۔(۸) رمضان شریف کے مہینے میں افطار کے وقت کی دُعا۔(۹) ماہ رمضان المبارک کے تمام دن ورات‘اور عید الفطر کی رات میں مانگی جانے والی دُعا۔(۱۰) عرفہ کے دن کی دُعا (۹ ذی الحجہ کو زوالِ آفتاب کے بعد سے غروبِ آفتاب تک)۔(ترمذی)(۱۱)مزدلفہ کی دُعا(۱۰ ذی الحجہ کو فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سے طلوعِ آفتاب سے پہلے تک۔(۱۲)جمعہ کی رات میں دُعا۔(ترمذی‘ نسائی) (۱۳) آدھی رات کے بعد سے صبح صادق تک۔(۱۴) آب زم زم پینے کے بعد۔(مستدرک حاکم)(۱۵)جہاد میں عین لڑائی کے وقت۔(ابوداوٗد)(۱۶)مسلمانوں کے اجتماع کے وقت۔ (صحاحِ سِتّہ)(۱۷)بارش کے وقت۔(ابوداوٗد)(۱۸)بیت اللہ پر پہلی نگاہ پڑتے وقت۔(ترمذی)

اسی طرح دُعا کے لیے مخصوص مقامات کی بھی کوئی قید نہیں‘ البتہ احادیث وآثار میں درج ذیل مقامات پر دُعائیں قبول ہونے کی صراحت موجود ہے:(۱) بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے۔(۲)مسجد نبوی ﷺ میں(۳)ملتزم‘ یعنی وہ جگہ جو حجر اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان ہے‘اس پر چمٹ کر دُعا کرنا۔(۴)میزابِ رحمت کے نیچے۔(۵)بیت المقدس میں۔ (۶) رکن و مقامِ ابراہیم کے درمیان۔(۷) صفا ومروہ پر۔(۸) مقامِ ابراہیمؑ کے پیچھے۔ (۹)اس جگہ جہاں سعی کی جاتی ہے۔(۱۰) عرفات میں۔(۱۱) آبِ زم زَم پیتے وقت۔ (۱۲)مشعر حرام‘ مزدلفہ میں۔(۱۳) رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان۔(۱۴) جمرۂ صغریٰ اور جمرۂ وسطیٰ کے پاس کنکریاں مارنے کے بعد۔

مستجاب الدعوات بندے

وہ حضرات جن کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں اور احادیث میں جن کی دُعاؤں کے قبول ہونے کی بشارت دی گئی ہے:

مظلوم کی دُعا یعنی ایسا شخص جس پر کسی طرح کا ظلم ہوا ہو۔(بخاری ومسلم)

مضطر یعنی مصیبت زدہ کی دُعا۔(بخاری ومسلم)

والدین کی دُعائیں اولاد کے حق میں تیزی کے ساتھ اثر کرتی ہیں‘ لہٰذا ہمیشہ ان کی دُعائیں لیتے رہنا چاہیے اور اُن کی بد دُعا سے بچنا چاہیے۔(مسلم) اسی طرح وہ اولاد جو والدین کے ساتھ

حسنِ سلوک کرے اور دل وجان سے ان کی خدمت کرے ان کی دُعاؤں میں بھی شانِ قبولیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مسافر یعنی جو اپنے گھر بار اور اہل وعیال سے دور ہو۔ مسافر آرام نہ ملنے کی وجہ سے مجبور اور پریشان ہوتا ہے۔ جب اپنی مجبوری اور حاجت مندی کی وجہ سے دُعا کرتا ہے تو اُس کی دُعا اخلاص سے بھری ہوتی ہے اور صدق دل سے نکلنے کی وجہ سے قبول ہوتی ہے۔ (ابوداؤد)

افطار کے وقت روزہ دار کی دُعا۔ یہ وقت لمبی بھوک پیاس کے بعد کھانے پینے کے لیے نفس کے شدید تقاضے کا ہوتا ہے۔ چونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ایک فریضہ کو انجام دیا ہے اور اُس کی خوشنودی کے لیے بھوک پیاس برداشت کی ہے اس لیے روزہ کے اختتام پر بندہ کو یہ مقام دیا جاتا ہے کہ اگر وہ اس وقت دُعا کرے تو ضرور قبول کی جائے گی۔ (ترمذی)

ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے لیے غائبانہ دُعا بھی مقبول ہے۔ اپنے لیے تو سب دُعا کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے بھی خصوصی اور عمومی دُعا کرنی چاہیے۔ خواہ کوئی دُعا کے لیے کہے یا نہ کہے' دوسروں کے لیے دُعا کرتے رہیں' کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ سب دُعاؤں سے بڑھ کر جلد از جلد قبول ہونے والی دُعا وہ ہے جو غائب کی غائب کے لیے ہو۔ (ترمذی) کیونکہ یہ دُعا ریاکاری سے پاک ہوتی ہے' محض خلوص اور محبت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان کی اپنے مسلمان بھائی کی غیر حاضری میں کی جانے والی دُعا قبول ہوتی ہے اور اُس کے سر کے پاس ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے بھائی کے لیے دُعا کرتا ہے تو فرشتہ آمین کہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ: تُو نے اپنے بھائی کے حق میں جو دُعا کی ہے' تیرے لیے بھی اس جیسی نعمت و دولت کی خوش خبری ہے۔ (مسلم)

حُجّاج و معتمرین کی دُعا۔ جو شخص حج یا عمرہ کے سفر پر نکلا ہو اس کی دُعا قبول ہونے کا وعدہ حدیث میں ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حج وعمرہ کے مسافر بارگاہِ الٰہی کے خصوصی مہمان ہیں۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں تو وہ قبول فرمائے گا اور اگر اُس سے مغفرت طلب کریں تو ان کی بخشش فرما دے گا۔ (ابن ماجہ ونسائی)

مریض اور مجاہد فی سبیل اللہ کی دُعا۔ احادیث سے ثابت ہے کہ مریض جب تک شفایاب نہ ہو اور مجاہد جب تک واپس نہ ہو ان کی دُعا بھی قبول ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب تم بیمار کے پاس جاؤ تو اس سے دُعا کے لیے کہو۔ (ابن ماجہ) مجاہد' اللہ کے راستہ میں اپنی جان و مال کی

قربانی دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا تو جب وہ دُعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دُعا قبول فرماتا ہے۔

دُعا قبول ہونے کی علامت

دُعا مانگتے وقت اپنے گناہوں کو یاد کرنا‘ اللہ کا خوف طاری ہونا‘ بے اختیار آنسو آ جانا‘ بدن کے روئیں کھڑے ہو جانا‘ اس کے بعد اطمینانِ قلب اور ایک قسم کی فرحت محسوس ہونا‘ بدن ہلکا معلوم ہونے لگنا‘ گویا کندھوں پر سے کسی نے بوجھ اُتار لیا ہو۔ جب ایسی حالت پیدا ہو تو اللہ کی طرف خشوعِ قلب کے ساتھ متوجّہ ہو کر اُس کی خوب حمد وثنا اور درود کے بعد اپنے لیے‘ اپنے والدین‘ رشتہ داروں‘ اساتذہ اور مسلمانوں کے لیے گڑگڑا کر دُعا کریں۔ ان شاء اللہ اس کیفیت کے ساتھ کی جانے والی دُعا ضرور قبول ہوگی۔ دُعا کی قبولیت میں جلدی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا وقت معیّن ہے۔ نا اُمید بھی نہیں ہونا چاہیے اور یوں نہیں کہنا چاہیے کہ میں نے دُعا کی تھی مگر قبول نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے نا امید ہونا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ دُعا کی قبولیت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی مطلوب سے بہتر کوئی دوسری شے انسان کو عطا فرماتا ہے‘ یا کوئی آنے والی مصیبت دور کر دیتا ہے۔

خلاصہ کلام

دُعا مظہرِ عبدیت اور ایک اہم عبادت ہے۔ یہ مضطربِ قلوب کے لیے سامانِ سکون‘ گمراہوں کے لیے ذریعۂ ہدایت‘ متقیوں کے لیے قربِ الٰہی کا وسیلہ اور گناہگاروں کے لیے اللہ کی بخشش ومغفرت کی بادِ بہار ہے۔ اس لیے ہمیں دُعا میں ہرگز کاہلی وسستی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ ہم دشمنوں سے نجات اور طرح طرح کی مصیبتوں کے دور ہونے کے لیے بہت سی تدابیر کرتے ہیں مگر وہ نہیں کرتے جو ہر تدبیر سے آسان اور مفید ہے (یعنی دُعا)۔ ہمیں چاہیے کہ اس اہم اور مہتم بالشان عبادت کے ارکان وشرائط اور واجبات ومستحبات کے ساتھ منہیات ومکروہات سے بچتے ہوئے اپنے خالق و مالک کے سامنے وقتاً فوقتاً خوب دُعائیں کریں۔ نیز ہمارا طرزِ عمل ایسا ہو کہ ہمیں کسی سے دُعا کے لیے کہنا نہ پڑے جبکہ اس کے دل سے ہمارے حق میں خود بخود دُعاؤں کے چشمے پھوٹیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تمام آداب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے‘ قبولیتِ دُعا کے کامل یقین کے ساتھ‘ خوب دُعائیں مانگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین! ۞۞۞

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۴)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(د) تابعینؒ کے تشریحی و تفسیری اقوال

تابعین عظام میں سے کچھ مشہور مفسّرین کا ذکر درج ذیل ہے:

(۱) حضرت مجاہدؒ

مجاہد بن جبر ابوالحجاج مخزومی' ۲۱ھ میں خلافتِ فاروقی کے دور میں پیدا ہوئے۔ حالت سجدہ میں آپ نے ۱۰۳ھ میں وفات پائی۔ آپؒ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے خاص شاگردوں میں سے اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ نے ان کی تفسیر کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ امام بخاریؒ اپنی الجامع الصحیح کی کتاب تفسیر میں بکثرت مجاہد کے اقوال نقل کرتے ہیں' اس سے بڑھ کر آپؒ کی ثقاہت و عدالت کی اور کیا شہادت ہو سکتی ہے۔ فضل بن میمون روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے مجاہد کو یہ کہتے سنا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو تیس مرتبہ قرآن پاک سنایا۔ نیز مجاہد سے یہ قول بھی مروی ہے کہ میں نے تین مرتبہ ابن عباسؓ کو قرآن سنایا۔ ہر آیت پر ٹھہر کر دریافت کرتا کہ یہ کیسے اور کہاں نازل ہوئی! ان دونوں روایتوں میں تعارض نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ حفظ وضبط اور تجوید وقراءت کے لیے مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ کو تیس مرتبہ قرآن سنایا ہو۔ پھر اس کے بعد قرآن کے معانی ومطالب اور اسرار و رموز معلوم کرنے کے لیے تین مرتبہ مزید سنایا ہو' جیسا کہ ابن ابی ملیکہؒ روایت کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجاہد' ابن عباسؓ سے قرآن کی تفسیر دریافت کر رہے ہیں اور ان کے ہمراہ ان کی تختیاں بھی ہیں۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ لکھتے جاؤ' حتیٰ کہ مجاہد نے مطلوبہ تفسیر لکھ لی (مقدمہ اصول تفسیر از ابن تیمیہؒ)۔ اپنی تفسیر میں ابن جریر' ابوبکر الحنفی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو یہ کہتے سنا کہ

جب مجاہد سے منقول تفسیر تمہیں میسّر آ جائے تو اسے کافی خیال کرو۔ امام ذہبیؒ تحریر کرتے ہیں کہ پوری اُمت مجاہد کی امامت اور ان سے اخذ و احتجاج کرنے پر متفق ہے۔ صحاحِ سِتّہ کے جامعین نے بھی آپ سے روایت کی ہے۔ قتادہ کا کہنا ہے کہ تفسیر کے جو علماء باقی ہیں‘ ان میں مجاہد سب سے بڑے عالم ہیں۔ علمائے کرام کے ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مجاہد کا پایہ فضیلت کس قدر بلند تھا۔ مجاہد اگرچہ تابعین میں سے ہیں لیکن صحابہ کرامؓ ان کی قدر کرتے تھے۔ مجاہد کا خود کہنا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی صحبت میں رہا اور میں ان کی خدمت کرنا چاہتا تھا‘ لیکن وہ میری خدمت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کی رکاب پکڑ کر فرمایا: ”کاش! میرا بیٹا سالم اور میرا غلام نافع حافظہ میں آپ جیسے ہو جائیں۔“

(۲) حضرت سعید بن جبیرؒ

آپ کا نام سعید بن جبیر بن ہشام اسدی اور کنیت ابومحمد یا ابوعبداللہ ہے۔ حبشی الاصل‘ سیاہ فام اور اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل تھے۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرات عبداللہ بن عباسؓ‘ عبداللہ بن عمرؓ‘ عبداللہ بن زبیرؓ‘ انس بن مالکؓ‘ عبداللہ بن مغفل اور ابومسعود البدری جیسے ممتاز صحابہ کرامؓ سے استفادہ کیا۔ آپ عبادت و زہد میں معروف ہیں‘ رات کو نماز میں کثرت سے رونے کی بنا پر ان کی بینائی میں نقص پیدا ہو گیا تھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قراءت و تفسیر کا درس لیا اور زیادہ تر ان کے دامن ہی سے وابستہ رہے۔ آپ نے مختلف صحابہ کی قراءتیں حفظ کر رکھی تھیں اور ان کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اسماعیل بن عبدالملکؒ بیان کرتے ہیں کہ سعید بن جبیر ماہ رمضان میں ہمیں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک رات ابن مسعودؓ کی قراءت کے مطابق پڑھتے‘ دوسری رات زید بن ثابتؓ کے مطابق اور اسی طرح ہر شب جداگانہ انداز میں تلاوت کیا کرتے۔ مختلف قراءتیں جمع کرنے کی بنا پر آپ قرآن پاک کے معانی و مطالب سے بھی پوری طرح آگاہ ہو گئے تھے‘ مگر تفسیر بالرائے کرنے سے احتراز کیا کرتے تھے۔

سعید بن جبیر کی ذات میں تمام تابعین کا علم یکجا ہو گیا تھا۔ دوسرے لوگ صرف ایک دو فنون میں مہارت و بصیرت رکھتے تھے‘ جبکہ آپ جامع الفنون تھے۔ خصیفؒ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ تابعین میں طلاق کے مسائل سب سے زیادہ سعید بن المسیّبؒ جانتے تھے‘ مناسکِ حج کا

علم عطاءؒ کو حاصل تھا‘ حلال وحرام کے عالم طاؤسؒ‘ تفسیر کے جاننے والے مجاہدؒ اور ان سب کے جامع سعید بن جبیرؒ تھے۔ انہی وجوہ کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کے علم پر بھروسا کرتے‘ اور جب اہلِ کوفہ آپؓ سے مسائل دریافت کرنے اور فتویٰ لینے آتے تو آپؓ فرماتے کہ کیا سعید بن جبیر تمہارے یہاں موجود نہیں! عمرو بن میمونؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: سعید بن جبیرؒ اللہ سے جاملے‘ سطحِ زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔ قتادہ کا قول ہے کہ سعید تابعین میں سب سے بڑے مفسّر تھے۔ ابوالقاسم طبری کا کہنا ہے کہ سعید ثقہ‘ حُجّت اور امام المسلمین تھے۔ ابن حبان نے سعید بن جبیر کو ثقات میں شمار کیا ہے اور کہا کہ وہ فاضل اور متقی انسان تھے۔ اصحابِ صحاحِ ستہ بھی آپ سے روایت کرنے میں متفق ہیں۔ سعید بن جبیر کی بہت سی روایات مرسل (جس میں صحابی کا واسطہ محذوف ہو) ہیں‘ لیکن ان کی مرسلات قابل اعتماد ہیں۔ یحییٰ بن سعید کا قول ہے کہ سعید بن جبیر کی مرسلات مجھے عطاء اور مجاہد کی مراسیل سے زیادہ پسند ہیں۔ ۹۵ھ میں آپ نے حجاج بن یوسف کے ہاتھوں ۴۹ برس کی عمر میں جام شہادت نوش کیا۔ حضرت سعید بن جبیر کا شہادت سے قبل حجاج کے ساتھ ایک مناظرہ منقول ہے‘ جس سے آپ کی قوت ایمانی‘ ایقان اور توکّل علی اللہ کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے۔

سعید بن جبیرؒ نے عبدالملک بن مروان کی فرمائش پر ایک تفسیر لکھی تھی اور خلیفہ نے اسے شاہی خزانہ میں محفوظ کرادیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ تفسیر عطاء بن دینارؒ (متوفی ۱۲۶ھ) کے ہاتھ آگئی اور وہ اس نسخہ کی بنیاد پر اس تفسیر کی روایات کو حضرت سعید بن جبیرؒ سے مرسلاً روایت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عطاء بن دینارؒ سے سعید بن جبیر کی جو (تفسیری) روایات منقول ہیں‘ وہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق ’وجادہ‘ (اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر کسی عالم کی صحیح طور پر پہچانی ہوئی تحریر کے کسی تحریری مجموعہ سے روایت کرے اور اس عالم سے اس کا سماع نہ ہوا ہو) ہیں اور بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔

(۳) حضرت عکرمہؒ

آپ عکرمہ مولیٰ ابن عباس کے نام سے مشہور اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ یہ بربری غلام تھے اور حصین بن ابی الحر العنبری نے انہیں بطور ہدیہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو پیش کیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان کو انتہائی محنت سے تعلیم دی۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ حضرات علیؓ‘

ابو ہریرہ‘ ابن عمر‘ ابوسعید خدری‘ عقبہ بن عامر‘ جابر‘ معاویہ‘ حسن بن علی اور بعض دوسرے صحابہ ؓ سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ عکرمہ کا اپنا قول ہے کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گزارے۔ ابن کثیر کے مطابق انہوں نے مصر‘ شام‘ عراق اور افریقہ تک کے سفر کیے۔ امام شعبی کا کہنا ہے کہ ہمارے زمانہ میں کتاب اللہ کا کوئی عالم عکرمہ سے بڑا باقی نہیں رہا۔ قتادہ کا قول ہے کہ تابعین میں چار آدمی سب سے زیادہ عالم تھے: عطاء‘ سعید بن جبیر‘ عکرمہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم۔ عکرمہ ؒ قرآن کی تفسیر میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور علماء نے فراخ دلی سے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ عکرمہ اپنے زمانے کے بہت بڑے فاضل قرآن وفقہ تھے۔ عمرو بن دینار کا قول ہے کہ جابر بن زید نے مجھے چند سوالات بتلا کر کہا کہ عکرمہ سے ان کے بارے میں پوچھئے‘ وہ علم کے بحر بیکراں ہیں۔ امام عکرمہ روایت حدیث میں امین‘ علم وفضل میں دوسروں پر فائق اور کتاب اللہ کے فہم وادراک میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ نے ۱۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔

حضرت عکرمہ پر اعتراضات کی حقیقت: بعض محدّثین نے عکرمہ پر کچھ اعتراض کیے ہیں اور ان کی ثقاہت پر بھی سوال اٹھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محقق علماء نے ان اعتراضات کو پوری تحقیق و تفتیش کے بعد ردّ کیا ہے۔ اس مسئلے پر حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ فتح الباری میں نہایت مبسوط اور کافی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ متعدد ائمہ حدیث نے عکرمہ کے حالات کی تحقیق اور ان پر عائد کیے جانے والے اعتراضات کی تفتیش کے لیے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں‘ جن میں حافظ ابن جریر طبری‘ امام محمد بن نصر مروزی‘ ابوعبداللہ بن مندہ‘ ابوحاتم بن حبان اور ابوعمر بن عبدالبر جیسے حضرات شامل ہیں۔ ابن حجر نے یہ بھی تحریر کیا کہ عکرمہ پر جو اعتراض وارد کیے جاتے ہیں‘ ان کا دارومدار تین باتوں پر ہے۔ پہلے یہ کہ انہوں نے بعض غلط باتیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کردی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ عقیدۃً خارجی تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ اُمراء وحکام سے ہدایا وصول کر لیتے تھے۔ جہاں تک آخری اعتراض کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسی غلط بات نہیں کہ جس پر ان کی روایات کو ردّ کیا جائے‘ سلف سے یہ طرزِ عمل ثابت ہے۔ باقی دو اعتراضات کے بارے میں ابن حجرؒ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ ان میں سے کوئی اعتراض یا الزام ان پر ثابت نہیں ہو پایا۔ اس ضمن میں جتنے قصے عکرمہ کی طرف منسوب ہیں‘ حافظ ابن حجر نے ایک ایک کو نقل کر کے اس کی مدلل تردید یا توجیہہ کی ہے۔ مثلاً ان پر جھوٹ کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کی وجہ ایک غلط فہمی

ہے۔ بسا اوقات عکرمہ نے ایک حدیث دو آدمیوں سے سنی ہوتی تھی۔ اب ایک موقع پر وہ ایک آدمی سے روایت کرتے‘ پھر اسی حدیث کے بارے میں کوئی پوچھتا تو دوسرے آدمی سے روایت کر دیتے۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ یہ حدیث کے حوالے سے افترا باندھتے ہیں‘ حالانکہ دونوں مرتبہ ان کی روایت صحیح اور درست تھی۔ اس لیے عکرمہ کا کہنا ہے کہ بھلا وہ لوگ جو میرے پیٹھ پیچھے میری تکذیب کرتے ہیں‘ میرے سامنے میری تکذیب کیوں نہیں کرتے! مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ لوگ میرے سامنے تکذیب کریں تو میں ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دوں۔ اسی طرح عکرمہ پر جو خارجی ہونے کا الزام لگایا گیا ہے‘ تو اس حوالے سے ابن حجر لکھتے ہیں کہ اگر عکرمہ کا خارجی ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے ان کی روایت میں فرق نہیں آتا‘ کیونکہ وہ اس بدعت کے داعی نہ تھے‘ مگر یہ بات (کہ وہ خارجی تھے) کسی دلیل و برہان سے ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح عکرمہ پر ایک یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف غلط بات منسوب کرنے کے خوگر تھے۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ عکرمہ حضرت ابن عباسؓ ہی کی صحبت و رفاقت میں رہا کرتے تھے‘ اس بنا پر حضرت ابن عباسؓ سے کثرتِ روایات کی وجہ سے ان کی صداقت و عدالت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ ایک فطری امر ہے اور اسے کسی طرح بھی افترا پردازی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کثرتِ روایت ایسا کوئی عیب نہیں کہ جس سے راوی کی ثقاہت و عدالت جاتی رہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ حدیث کے حوالے سے کثیر الروایت ہیں۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ دوسرے اصحاب اپنے کاروبارِ دنیا میں بھی مصروف رہتے جبکہ مجھے رفاقت نبویؐ کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ اب اس کے قطعاً یہ معنی نہیں کہ اس وجہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی ثقاہت و صداقت خدانخواستہ مشکوک ہو گئی۔ عکرمہ بھی اس اعتراض سے نابلد نہ تھے‘ وہ کہا کرتے کہ کاش جو لوگ میری تکذیب کرتے ہیں وہ میرے روبرو کریں اور میں انہیں جواب دوں (یعنی مطمئن کروں)۔ عثمان بن حکیمؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ابوامامہ سہل بن حنیفؒ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ عکرمہ بھی آ گئے۔ کہنے لگے: ابوامامہ! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں‘ سچ بتائیے کہ کیا آپ نے ابن عباسؓ کو یہ کہتے سنا تھا: عکرمہ جو کچھ بھی مجھ سے سن کر بیان کرے‘ اس کی تصدیق کیجیے کہ اس نے مجھ پر جھوٹ نہیں باندھا۔ ابوامامہؒ نے جواب دیا: جی ہاں!

صاحبِ عدل نقاد حدیث کے اقوال ظاہر اور ثابت کرتے ہیں کہ عکرمہ جلیل القدر تابعی اور قابلِ اعتماد تھے۔ ان کی ثقاہت وعدالت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا تھی۔ ان کے بارے میں جو بھی اعتراضات اٹھائے گئے ہیں' وہ رقابت کا شاخسانہ اور ان کا مقصد ان کی عظمت گھٹانا اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف سے ہٹانا ہے۔ ذیل میں علمائے جرح وتعدیل کے ان کے بارے میں چند اقوال درج کیے جاتے ہیں:

محدّث ابن معینؒ کہتے ہیں کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص عکرمہ اور حماد بن ابی سلمہ پر نکتہ چینی کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ اس کا اسلام مشکوک ہے۔ امام العجلیؒ کا قول ہے کہ عکرمہ ایک ثقہ تابعی ہیں' ان پر خارجی ہونے کا الزام ایک بہتان ہے۔ امام بخاریؒ کا کہنا ہے کہ ہمارے سب اصحاب عکرمہ کی روایات سے احتجاج کرتے ہیں۔ امام نسائیؒ نے عکرمہ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام بخاری' ابوداؤد اور دیگر ممتاز محدثین آپ سے روایت کرتے ہیں۔ امام مسلمؒ بھی آخر کار آپ کی تعدیل کرنے اور آپ سے روایت لینے لگے۔ امام مروزیؒ کا بیان ہے کہ عکرمہ سے اخذ ونقل پر جملہ محدثین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے' ہمارے معاصر اکابر محدّثین نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے' مثلاً احمد بن حنبل' ابن راہویہ' یحییٰ بن معین' ابوثور وغیرہم۔ میں (یعنی امام مروزی) نے ابن راہویہ سے عکرمہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے اس سوال پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا: عکرمہ تو ہمارے نزدیک امام الدنیا ہیں۔ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا کہ: کیا عکرمہ کی روایت سے احتجاج کیا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں!

(۴) حضرت طاؤسؒ

آپ طاؤس بن کیسان الحمیری الجندی ہیں اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔ یہ غلام تھے اور یمن کے شہر جند کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے حضرات عبداللہ بن عباسؓ' عبداللہ بن مسعودؓ' عبداللہ بن عمرؓ' زید بن ثابتؓ' زید بن ارقمؓ' عبداللہ بن عمرو بن العاص اور متعدد دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسب فیض کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین سے ان کی روایات مرسل ہیں۔ طاؤس تفسیر قرآن' علم وفضل کے علاوہ عبادت وزہد میں بھی بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے چالیس بار حج کی سعادت حاصل کی۔ خود طاؤس کا قول ہے کہ میں پچاس صحابہ کی صحبت میں رہ کر ان سے استفادہ کر چکا ہوں۔ دیگر صحابہ کی نسبت آپ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

کے چشمہ علم وفضل سے خوب سیراب ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں طاؤس کو جنّتی خیال کرتا ہوں۔ عمرو بن دینارؒ کا قول ہے کہ میں نے طاؤس جیسا صالح آدمی نہیں دیکھا' (اور) میں نے لوگوں کے مال و دولت کے معاملے میں طاؤس سے زیادہ سیر چشم کوئی نہیں دیکھا۔ ابن معین کے مطابق طاؤس ثقہ ہیں۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ طاؤس اہل یمن کے عبادت گزاروں میں شامل تھے' آپ تابعین کے سردار اور مستجاب الدعوات تھے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان (طاؤس) کی جلالتِ قدر' فضیلت' وفورِ علم' صلاح وتقویٰ' قوّتِ حافظہ اور احتیاط پر علماء کا اتفاق ہے۔ ابونعیم اصفہانیؒ نے حلیة الاولیاء میں ان کے صلاح وتقویٰ کے واقعات اور ملفوظات تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ ۱۰۵ھ میں منیٰ یا مزدلفہ میں طاؤس کی وفات ہوئی۔ جنازے میں علماء وصلحاء' ارکانِ حکومت اور عوام کی کثیر تعداد شریک تھی۔

(۵) حضرت عطاء بن ابی رباحؒ

اسم گرامی عطاء بن ابی رباح' مکی قرشی اور کنیت ابومحمد ہے۔ آپ ابن خثیم قریشی کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے۔ ۲۷ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۱۴ھ میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ تابعین کے دور میں عطاء نام کے چار بزرگ عطاء بن ابی رباح' عطاء بن یسار' عطاء بن السائب اور عطاء الخراسانی ﷭ بہت مشہور ہیں۔ ان میں پہلے دو بالاتفاق ثقہ ہیں' آخری دو کے بارے میں کچھ کلام ہوا ہے۔ مگر علومِ دینیہ کی کتابوں میں جب صرف عطاء لکھا جاتا ہے تو عموماً عطاء بن ابی رباح ہی مراد ہوتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن زبیر' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عائشہ اور دوسرے کئی صحابہ ﷺ سے استفادہ کیا۔ ان کا خود کہنا ہے کہ میں نے دوصد صحابہ کرامؓ کا زمانہ پایا ہے۔ آپ ثقہ' عالم' محدّث اور فقیہہ تھے' خاص طور پر علمِ فقہ میں آپ بہت مشہور ہوئے' عبادت وزہد میں بھی معروف تھے۔ اہلِ مکّہ کی فتویٰ نویسی آپ پر ختم ہوگئی تھی۔ جب اہلِ مکّہ حضرت ابن عباسؓ سے استفادہ کرنے اور فتویٰ پوچھنے آئے تو آپ فرماتے: اے اہلِ مکّہ! تم میرے پاس آتے ہو' حالانکہ تمہارے درمیان عطاء جیسا شخص موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپؒ اپنے زمانے میں مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ میں نے اپنے ملنے والوں میں سے عطاء جیسا کسی کو نہیں پایا۔ امام اوزاعیؒ کے مطابق عطاء جب فوت ہوئے تو وہ سب لوگوں کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھے۔

ابن جریجؒ کہتے ہیں کہ بیس سال تک مسجد کا فرش ان کا بستر رہا۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے اعتبار سے عطاء تابعین کے سرخیل تھے۔ محمد بن عبداللہ الدیباج کا قول ہے کہ میں نے کوئی مفتی عطاء سے بہتر نہیں دیکھا' ان کی مجلس مسلسل ذکر اللہ کی معمور رہتی تھی جس کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں تھا' اسی دوران ان سے (فقہی) سوال کیا جاتا تو بہترین جواب دیتے۔ اصحاب صحاح ستہ' عطاء بن ابی رباح سے اخذ ونقل کرتے ہیں۔

درج بالا بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عطاء بلند پایہ عالم' ثقہ اور راست گفتار تھے۔ ان کے استاد حضرت ابن عباسؓ نے بھی اس کی شہادت دی ہے۔ قتادہؒ کہا کرتے تھے کہ تابعین کے جید علماء چار تھے۔ مناسک حج کے سب سے بڑے عالم عطاءؒ تھے' سب سے بڑے مفسر قرآن سعید بن جبیرؒ تھے' سیر ومغازی میں سب سے زیادہ شہرت عکرمہؒ کو حاصل ہوئی اور حلال وحرام کے بڑے عالم حسن بصریؒ تھے۔ تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے تلامذہ میں سے عطاء کثیر الروایت نہ تھے' دوسرے ساتھی (تلامذہ) اس ضمن میں ان سے سبقت لے گئے۔ مگر عطاء بن ابی رباح کو تفسیر میں جو مقام حاصل ہے' اس سے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ قلت روایت کی وجہ ان کی حد درجے احتیاط اور کسی بھی قسم کی تفسیر بالرائے سے اجتناب ہے۔ عبدالعزیز بن رفیع بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے ایک مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا' انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سائل نے کہا کہ اپنی رائے (اور سوچ) سے بیان کر دیں۔ عطاء نے کہا کہ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میری رائے کو دین قرار دیا جائے۔ البتہ عطاء بن ابی رباح جن صحابہ کرامؓ سے روایت کرتے ہیں' ان سب سے ان کا سماع ثابت نہیں' جیسے حضرات عبداللہ بن عمر' ابوسعید خدری' ابوالدرداء' اسامہ' اُمّ سلمہ اور اُمّ ہانی' فضل بن عباس' رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ اس لیے ان تمام حضرات سے ان کی بلاواسطہ روایتیں مرسل ہیں۔

(٦) حضرت سعید بن المسیّبؒ

آپ سعید بن المسیّب بن حزن القرشی المخزومی' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں' اسی لیے حضرت ابوہریرہؓ کی بہت سی روایات آپ ہی سے مروی ہیں۔ عبادت وزہد کا یہ حال تھا کہ چالیس سال تک کوئی اذان ایسی نہیں ہوئی جو انہوں نے مسجد میں نہ سنی ہو۔ مسلسل روزے رکھتے تھے اور چالیس مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ہدایہ قبول نہیں کرتے تھے اور گزر بسر تیل

وغیرہ کی تجارت پر تھی۔ امام مالکؒ نے ان کا قول نقل کیا ہے کہ میں بعض اوقات صرف ایک حدیث کی طلب میں کئی کئی دن رات کا سفر کیا کرتا تھا۔ آپ کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے تیسرے سال ہوئی‘ اس لیے آپؒ نے بہت سے صحابہ کرامؓ سے احادیث سنی ہیں۔ جن اصحابِ رسول سے سعید بن المسیبؒ نے براہِ راست احادیث نہیں سنیں‘ ان سے اکثر بلاواسطہ (مرسلاً) روایت کرتے ہیں۔ ان کی مراسیل بہت سے ایسے علماء اور فقہاء کے نزدیک بھی قابلِ قبول ہیں جو مرسل کو حجّت نہیں مانتے‘ جیسے امام شافعیؒ مرسل کو قابل استدلال نہیں سمجھتے لیکن ان کا قول ہے کہ ابن مسیّب کی مرسل روایات ہمارے نزدیک حسن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ثقہ راویوں سے ہی روایات لیتے تھے اور غیر ثقہ کی روایات بیان نہیں کرتے تھے۔ امام نوویؒ کے مطابق شوافع میں مرسل روایت کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی مسند روایت سے یا کسی اور مرسل سے یا بعض صحابہ کے اقوال سے یا صحابہؓ کے بعد اکثر فقہاء کے اقوال سے اس کی تائید ہو جائے تو اسے قبول کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ البتہ احناف کے نزدیک سعید بن المسیّب کی مراسیل علی الاطلاق قابلِ اعتماد اور حجّت ہیں۔ آپ کی رحلت کے بارے میں ۹۱ھ سے لے کر ۱۰۵ھ تک مختلف اقوال ہیں۔

(۷) حضرت زید بن اسلمؒ

آپ زید بن اسلم العمری المدنی ہیں‘ کنیت ابوعبداللہ اور تعلق مدینہ منورہ سے ہے۔ آپ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ نے حضرت ابن عمر‘ حضرت ابوہریرہ‘ حضرت جابرؓ‘ حضرت انس‘ حضرت سلمہ بن الاکوع اور حضرت عائشہؓ سے روایات اخذ کی ہیں۔ علمِ تفسیر کے بہت بڑے عالم اور بالاتفاق ثقہ ہیں۔ مسجدِ نبوی میں ان کا اپنا حلقہ درس ہوتا تھا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؒ کے بقول میرے والد کبھی مجھے اپنے کسی شاگرد کے پاس بھیجتے تو وہ میرے سر کو بوسہ دے کر فرماتے کہ خدا کی قسم! تمہارے والد ہمیں اپنے اہل وعیال سے بھی زیادہ محبوب ہیں اور اگر ہمیں یہ خبر دی جائے کہ یا ہمارے اہل وعیال کو موت آئے گی یا زید بن اسلم کو اور ہمیں یہ اختیار ملے کہ جس کی موت کو چاہیں اختیار کر لیں‘ تو ہماری خواہش ہوگی کہ زید بن اسلم زندہ رہیں۔ حضرت ابوحازم کا کہنا ہے کہ ہم حضرت زید بن اسلم کی مجلس میں چالیس فقہاء کے ساتھ رہتے تھے‘ ہم سب کی ادنیٰ خصلت یہ تھی کہ اپنی املاک سے

ایک دوسرے کی غم خواری کرتے تھے اور اس مجلس میں مجھے کبھی دو آدمی بھی ایسے نظر نہیں آئے جو کسی بے فائدہ گفتگو (موضوع) پر بحث یا جھگڑا کر رہے ہوں۔

حضرت زید بن اسلم کا شمار ان کبار تابعین میں ہوتا ہے جنہوں نے روایت تفسیر میں شہرت پائی۔ امام احمد بن حنبلؒ، ابوزرعہؒ، ابوحاتمؒ، نسائیؒ اور دیگر محدثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ان کی ثقاہت و عدالت پر اس سے بڑھ کر کیا شہادت ہوسکتی ہے کہ اصحابِ صحاحِ ستہ ان سے اخذ و روایت کرنے پر متفق نظر آتے ہیں۔ زید بن اسلم اپنے معاصرین میں کثرتِ علم کی بنا پر ممتاز تھے اور بعض ہم عصر بھی آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین رحمہ اللہ علیہ)، زید بن اسلم کے پاس حاضر ہو کر علمی استفادہ کرتے تھے۔ نافع بن جبیر بن مطعمؒ نے ان سے کہا کہ آپ اپنی قوم کی علمی مجالس چھوڑ کر آلِ خطاب کے غلام زید بن اسلم کے یہاں آتے ہیں! (اس پر) علی بن حسینؒ نے فرمایا کہ آدمی اس شخص کی صحبت اختیار کرتا ہے جس سے کچھ دینی فائدہ ہوتا ہو۔ علمائے مدینہ میں سے جنہوں نے زید بن اسلم سے تفسیر کا درس لیا، ان میں درج ذیل مشہور ہیں: (ا) ان کے صاحب زادے عبدالرحمٰن بن زیدؒ (ب) امام مالکؒ بن انس، صاحب موطا۔ یہاں واضح رہے کہ عبدالرحمٰن اپنے زہد و تقویٰ کے باوجود اکثر محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ حافظ ذہبی کا کہنا ہے کہ حضرت زید بن اسلم کی ایک تفسیر ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن زید روایت کرتے تھے، لیکن زید بن اسلم کی جو تفسیری روایات ان کے صاحب زادے عبدالرحمٰن سے مروی ہیں وہ پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔ آپ نے ۱۳۶ھ میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔

(۸) حضرت ابوالعالیہؒ

آپ رفیع بن مہران الریاحی ہیں اور کنیت ابوالعالیہ ہے۔ بنی ریاح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے۔ زمانہ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے دو سال بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ ابوالعالیہ حضرات علی، ابن مسعود، اُبی بن کعب، ابن عباس، ابوموسیٰ، ابوایوب اور ابوبرزہ وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔ قرآن پاک کے بہترین حافظ اور قاری تھے۔ اپنی علمی فضیلت کی بنا پر ابوالعالیہ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے تھے جبکہ دوسرے لوگ

نیچے بیٹھے ہوتے اور فرماتے تھے کہ علم اس طرح انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے۔ حلیۃ الاولیاء کے مطابق ماوراء النہر کے علاقے میں سب سے پہلے اذان دینے والے ابوالعالیہ ہی تھے۔ اکابر تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ابن معین' ابوزرعہ' ابوحاتم اور دیگر محدّثین نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ صحاحِ ستّہ کے اصحاب کا ابوالعالیہ سے روایت کرنے پر اتفاق ہے۔ حضرت اُبی بن کعب سے تفسیر قرآن کا ایک ضخیم نسخہ منقول ہے' جسے ابوجعفر رازی نے بروایت ربیع بن انس از ابوالعالیہ از اُبی بن کعب نقل کیا ہے' یہ سند صحیح ہے۔ مفسّر ابن جریر' ابن حاتم اور حاکم نے اپنی مستدرک میں اس نسخہ سے بکثرت روایات نقل کی ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ صحیح تر قول کے مطابق ۹۰ھ میں ابوالعالیہ نے وفات پائی (تہذیب التہذیب)۔

(۹) حضرت محمد بن کعب القرظیؒ

آپ محمد بن کعب بن سلیم بن اسد القرظی المدنی ہیں اور ابوحمزہ یا ابوعبداللہ کنیت ہے۔ آپ کے والد بنوقریظہ سے تعلق رکھتے تھے اور غزوۂ بنوقریظہ کے موقع پر نابالغ ہونے کی وجہ سے انہیں امان دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن کعب قرظی حضور ﷺ کی حیات میں ہی پیدا ہو چکے تھے۔ آپ نے حضرات علی' ابن مسعود' ابن عباس' ابن عمر' ابوہریرہ' جابر' انس بن مالک' براء بن عازب' معاویہ' کعب بن عجرہ' زید بن ارقم' مغیرہ بن شعبہ' عبداللہ بن جعفر اور دوسرے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایات اخذ کی ہیں۔ محمد بن کعب قرظی کے بارے میں ابن سعد کا کہنا ہے کہ ثقہ اور کثیر الحدیث عالم تھے۔ امام عجلی کے مطابق ثقہ اور صالح ہیں اور قرآن کریم کے عالم ہیں۔ عون بن عبداللہ کا قول ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ امام نووی کا کہنا ہے کہ ان کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے۔ محدّث ابنِ حبان کے بقول محمد بن کعب مدینہ کے فضلاء میں شمار ہوتے تھے' ایک مرتبہ مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے کہ اچانک چھت گر پڑی' جس سے آپ اور چند رفقاء کی موت واقع ہوگئی۔ آپ شروع میں کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے' بعد میں دوبارہ مدینہ واپسی ہوگئی۔ مختلف اقوال کے مطابق محمد بن کعب القرظی کا ۱۰۸ھ اور ۱۲۰ھ کے درمیان وصال ہوا (تہذیب الاسماء)۔

(۱۰) حضرت علقمہؒ

آپ علقمہ بن قیس بن عبداللہ النخعی الکوفی ہیں اور کنیت ابوشُبیل ہے۔ آپ کوفہ کے

باشندے ہیں۔ پیدائش حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی ہو چکی تھی۔ علقمہ نے حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے۔ آپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد خاص اور ان کے علم و فضل سے خوب آشنا تھے۔ صورت و سیرت میں بھی ان کے بڑے مشابہ تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایات کے حوالے سے آپ پر خاص اعتماد کیا جاتا ہے۔ نہایت خوش الحان قاری تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آپ کو بلا کر قرآن پاک سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ علقمہ نے ایک رات میں مکمل قرآن پاک ختم کر لیا۔ بالاتفاق ثقہ ہیں اور علم فقہ میں خصوصاً آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ انتہائی متواضع بزرگ تھے اور ذاتی حلقہ درس بنانا آپ کو پسند نہیں تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے چلیں اور ایک دوسرے سے کہیں کہ یہ علقمہ ہیں۔ آپ نے اپنے مکان کے علاوہ قرآن پاک کا ایک نسخہ اور ایک گھوڑا ورثہ میں چھوڑا۔ ابوالمثنیٰ کا قول ہے کہ جب تم علقمہ کو دیکھ لو تو ابن مسعود کو نہ دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، وہ ان سے بڑی حد تک مشابہ تھے۔ عبدالرحمٰن بن یزید کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: ''میں جو کچھ پڑھتا یا جانتا ہوں، علقمہ بھی جانتے ہیں''۔ آپ نہایت ثقہ، امین، راست باز اور زہد و تقویٰ میں بلند مقام کے حامل تھے۔ احمد بن حنبل کا قول ہے کہ علقمہ صالح اور ثقہ شخص ہیں، اصحابِ ستّہ آپ سے روایت کرنے میں متفق ہیں۔ آپ کے سفر آخرت کے بارے میں ۶۲ھ سے ۷۳ھ تک مختلف اقوال ملتے ہیں (تہذیب التہذیب)۔

(۱۱) حضرت مسروقؒ

آپ مسروق بن اَجدع بن مالک الکوفی ہیں اور ابوعائشہ کنیت ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے ان کا نام دریافت کیا تو جواب دیا کہ میرا نام مسروق بن اجدع ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اَجدع تو شیطان کو کہتے ہیں، آپ مسروق بن عبدالرحمٰن ہیں۔ آپ نے خلفائے راشدین، حضرت اُبی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علمی استفادہ کیا۔ آپ حضرت ابن مسعودؓ کے خاص شاگردوں میں سب سے ممتاز اور زہد و تقویٰ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ کوفہ کے مشہور قاضی شریح مشکل مسائل میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ امام شعبی کا کہنا ہے کہ میں نے مسروق سے بڑھ کر علم کا شائق نہیں دیکھا۔ امام بخاری کے استاد محدث علی بن مدینیؒ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعودؓ کے تلامذہ میں سے مسروق پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔ امام حدیث علی

بن مدینی کی شہادت کی اساس یہ ہے کہ مسروق نے اکابر صحابہؓ خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی صحبت و رفاقت حاصل کر کے علم و فضل کا لاجواب خزانہ جمع کر لیا تھا۔ یہ اصحاب رسولؐ اور حضرت ابن مسعودؓ کے فیض ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ اپنے عہد کے امام تفسیر اور کتاب اللہ کے معانی و مطالب کے جید عالم و فاضل قرار پائے۔

مسروق کے درج ذیل قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تفسیر قرآن کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کتنا استفادہ کیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ ابن مسعودؓ ہمیں قرآن پاک کی کوئی سورت سناتے اور پھر دن بھر اس کی تفسیر بیان کرتے رہتے۔ جہاں تک مسروق کی ثقاہت وعدالت کا تعلق ہے' یہ ایک ایسا امر ہے جس پر علمائے جرح و تعدیل نے اتفاق کیا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ مسروق جیسے شخص کی عدالت کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ مسروق ثقہ تھے اور انہوں نے احادیثِ صالحہ روایت کی ہیں۔ ابن حبان نے بھی آپ کا شمار ثقہ رواۃ و رجال میں کیا ہے۔ صحاح ستہ کے جامعین نے بالاتفاق آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ محدث شعبہ نے ابواسحاق کا قول نقل کیا ہے کہ مسروق حج کو گئے تو کیفیت یہ تھی کہ سوتے بھی سجدہ کی حالت میں تھے۔ مشہور قول کے مطابق آپ کا انتقال ۶۳ھ میں ہوا۔

(۱۲) حضرت نافعؒ

آپ نافع بن ہرمز اور بعض کے نزدیک نافع بن کاؤس ہیں اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ نیشاپور کے باشندے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نافع نے حضرات ابوہریرہ' ابوسعید خدری' ابولبابہ' ابن عمر' نافع بن خدیج اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے تحصیل علم کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے تلامذہ میں سے دو حضرات کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد قرار دیا گیا ہے' ایک ان کے صاحبزادے سالمؒ اور دوسرے ان کے غلام نافعؒ۔ امام نووی کا کہنا ہے کہ ان کی جلالت قدر اور توثیق پر اجماع ہے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ (حدیث کی) تمام اسانید میں سے سب سے زیادہ صحیح سند (سلسلۃ الذھب) عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ ہے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ لقد منّ اللّٰہ تعالیٰ علینا بنافع (اللہ تعالیٰ نے نافع کے ذریعے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے)۔ تہذیب التہذیب کے مطابق ابن حجرؒ تحریر کرتے ہیں کہ جتنی احادیث انہوں نے روایت کی ہیں' ان میں کوئی غلطی نہیں دریافت ہوئی۔ حضرت نافع کے خاص

شاگرد امام مالکؒ کا بیان ہے کہ آپ بہت متواضع بزرگ تھے‘ عموماً ایک سیاہ چادر اوڑھے رہتے اور بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ خود نافع کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کی تیس سال خدمت کی‘ اس کے بعد ابن عامر نے انہیں پیشکش کی کہ وہ مجھے تیس ہزار درہم میں ان کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ابن عامر کے دراہم مجھے فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں‘ جاؤ تم آزاد ہو۔ ۱۱۷ھ میں نافع سفر آخرت کو روانہ ہوئے۔

(۱۴) حضرت شعبیؒ

آپ عامر بن شراحیل الشعبی الحمیری ہیں اور کنیت ابوعمرو ہے۔ شعبی کوفہ کے مشہور فقہائے تابعین میں سے ہیں اور آپ وہاں کے قاضی بھی رہے۔ شعبی نے تقریباً پانچ سو صحابہ کرامؓ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ آپ کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا‘ عمر بھر احادیث لکھ کر کبھی یاد نہیں کیں۔ خود فرماتے کہ جو شخص مجھے کوئی بات سناتا ہے‘ مجھے فوراً یاد ہو جاتی ہے۔ آپ کا اپنا بیان ہے کہ مجھے سب سے کم جو چیز یاد ہے وہ اشعار ہیں‘ اس کے باوجود اگر میں چاہوں تو مہینہ بھر تک شعر سناتا رہوں اور کوئی شعر مکرر نہ ہو۔ شعبیؒ امام ابوحنیفہؒ کے خاص اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ کی عظمت اور جلالت قدر پر اتفاق ہے۔ محدّث العجلی کے مطابق شعبی نے اڑتالیس صحابہؓ سے احادیث نبویہ کا سماع کیا۔ امام احمد اور عجلی کا کہنا ہے کہ ان (شعبی) کی مراسیل بھی صحیح ہیں‘ کیونکہ وہ صرف صحیح روایات کو ہی مرسلاً بیان کرتے ہیں۔ مکحول کا قول ہے کہ میں نے شعبی سے بڑھ کر فقیہہ آج تک نہیں دیکھا۔ ابن عیینہؒ تحریر کرتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ صحابہ کے بعد اپنے اپنے زمانے میں تین آدمی یکتائے روزگار تھے: (ا) حضرت ابن عباسؓ (ب) شعبیؒ (ج) سفیان ثوریؒ۔ محدث ابن شبرمہ کے مطابق انہوں نے شعبی کو یہ کہتے سنا: جو بات بھی میں نے لکھی یا کسی سے سنی وہ مجھے ازبر ہو گئی‘ جب بھی کسی نے کوئی حدیث مجھے سنائی تو میں نے اس کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ابوجعفر طبری کا قول ہے کہ شعبی بڑے عالم اور فقیہہ تھے۔ ابواسحاق الحبال لکھتے ہیں کہ شعبی مختلف علوم میں ماہر تھے۔ سلیمان بن ابی مجلز کا بیان ہے کہ میں نے شعبی سے بڑا فقیہہ نہیں دیکھا‘ حتیٰ کہ ابن المسیّب‘ طاؤس‘ عطاء‘ حسن بصری اور ابن سیرین بھی ان کے ہم پلّہ نہ تھے۔ ابن معین‘ ابوزرعہ اور بکثرت دیگر محدّثین کے مطابق شعبی ثقہ ہیں۔ صحاحِ ستّہ کے جامعین نے بالاتفاق آپ سے روایت لی ہے۔

ایک فاضل جید عالم اور بلند پایہ فقیہہ ہونے کے باوجود امام شعبی قرآن مجید کی تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے۔ جب کسی آیت کی تفسیر کے حوالے سے انہیں علمائے سلف کا کوئی قول معلوم نہ ہوتا تو سوال کا جواب نہ دیتے۔ ابن عطیہ کا کہنا ہے کہ اکابر علمائے سلف مثلاً سعید بن المسیّب اور شعبی تفسیر قرآن کو بڑی وقعت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور علم وفضل کے باوصف زہد وتقویٰ کی بنا پر تفسیر بالرائے سے کنارہ کش رہتے تھے۔ ابن جریر طبری اپنے مقدمہ تفسیر میں شعبی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے ہر آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا ہے مگر اس میں احتیاط کی ضرورت ہے' یہ کلام الٰہی کی تفسیر کا معاملہ ہے۔ شعبی کی ولادت اور وفات کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ مشہور ترین قول یہ ہے کہ آپ ۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۹ھ میں انتقال فرمایا۔ (تہذیب التہذیب)

(۱۴) حضرت قتادہؒ

آپ قتادہ بن دِعامہ السدوسی البصری ہیں اور ابوالخطاب کنیت ہے۔ آپ پیدائشی طور پر نابینا' عربی الاصل اور بصرہ کے رہائشی تھے۔ قتادہ نے حضرت انسؓ' ابوالطفیلؒ' عکرمہؒ' عطاء بن رباحؒ اور ابن سیرینؒ سے احادیث روایت کیں۔ آپ وافر قوتِ حافظہ سے بہرہ ور' عربی اشعار کے عالم' ایام العرب اور علم الانساب کے زبردست ماہر اور عربی زبان وادب میں بصیرتِ تامہ رکھتے تھے۔ مفسّر قرآن کی حیثیت سے بھی قتادہ ایک عظیم مقام کے حامل ہیں۔ عمرو بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سعید بن المسیّب کے ہاں قتادہ آئے اور کئی روز قیام کر کے ان سے دینی مسائل واحکامات دریافت کرتے رہے۔ آخر میں سعید نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے جو کچھ مجھ سے پوچھا ہے' وہ سب یاد ہے؟ قتادہ نے جواب دیا کہ جی ہاں! میں نے آپ سے فلاں بات پوچھی اور آپ نے اس کا یہ جواب دیا اور فلاں سوال کا آپ نے یہ حل پیش کیا کہ حسن بصریؒ نے یوں کہا۔ سعید بن المسیّب بولے کہ میں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ جیسا اور انسان بھی پیدا کیا ہے۔ اپنی قوتِ حافظہ کے بارے میں قتادہ کا اپنا بیان ہے کہ میں نے کبھی کسی محدّث سے حدیث کو دوبارہ سنانے کی فرمائش نہیں کی اور میرے کانوں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جسے میرے دل نے یاد نہ کرلیا ہو۔ مزید کہا کہ قرآن پاک کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں کچھ نہ کچھ (یعنی کوئی نہ کوئی روایت یا قول) میں نے سن نہ رکھا ہو۔ امام احمد کے مطابق قتادہ تفسیر

کے زیادہ بڑے عالم ہیں۔ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ قتادہ جیسا دوسرا کوئی حافظے والا میں نے نہیں دیکھا۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ حضرت انسؓ کے اصحاب و تلامذہ میں سے ثقہ ترین زہری ہیں اور پھر قتادہ۔ ان کی ثقاہت و عدالت کے لیے یہی کافی ہے کہ صحاحِ سِتّہ کے مؤلفین ان سے اخذ و احتجاج کرتے ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ کے مطابق قتادہ کا انتقال ۱۱۸ھ میں طاعون کی وبا سے شہر واسط میں ہوا۔

(۱۵) حضرت حسن بصریؒ

آپ الحسن بن ابی الحسن یسار البصری ہیں اور کنیت ابوسعید ہے۔ آپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (بعض حضرات کے قول کے مطابق جمیل بن قطبہ) کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ آپ کی والدہ خیرہ، اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ کنیز تھیں، چنانچہ آپ نے گاہے بگاہے حضرت اُمّ سلمہؓ کا دودھ بھی پیا ہے۔ ابن سعد تحریر کرتے ہیں کہ حسن بصریؒ خلافت فاروقی کے آخری دو سالوں میں کسی وقت پیدا ہوئے اور وادی القریٰ میں پروان چڑھے۔ آپ بڑے فصیح و بلیغ، عابد و زاہد اور یکتائے روزگار خطیب تھے اور سامعین ان کے وعظ سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ آپ نے حضرات علی، ابن عمر، انس رضی اللہ عنہم اور کثیر صحابہ و تابعین سے احادیث روایت کیں۔ حسن بصری نے بہت سے صحابہ کی زیارت کی اور ان سے علم بھی حاصل کیا۔ علم و فضل اور عبادت و زہد میں آپ کی جلالتِ قدر مسلّم ہے۔ قرآن و حدیث اور فقہ کے بھی بلند پایہ عالم تھے۔ صحاحِ سِتّہ کے جامعین نے بھی حضرت حسن بصری سے روایت کی ہے۔ آپ کے پُرحکمت ملفوظات بھی بہت مشہور ہیں۔ اس کے ساتھ آپ نہایت بہادر مجاہد بھی تھے، متعدد معرکوں میں شریک ہوئے۔

حضرت انس بن مالکؓ کا قول ہے کہ دینی مسائل حسن بصری سے پوچھا کریں، انہیں وہ مسائل یاد ہیں اور ہم (اس عمر میں) بھول گئے۔ سلیمان التیمی کا کہنا ہے کہ حسن بصری اہلِ بصرہ کے استاد ہیں۔ قتادہ کے بقول: میں جس فقیہہ کی صحبت میں بیٹھا، حسن بصری کو اس سے بڑھ کر پایا۔ بکر المزنی کا بیان ہے کہ جو شخص دورِ حاضر کے منفرد عالم کو دیکھنا چاہے، وہ حسن بصری کو دیکھ لے، ہم نے ان سے بڑھ کر عالم نہیں دیکھا۔ ابن سعد کے مطابق حسن بصری عظیم عالم، بلند پایہ فقیہہ، نہایت ثقہ، بڑے عابد و زاہد، حد درجہ فصیح و بلیغ اور حسین و جمیل تھے۔ ابوجعفر الباقر کے سامنے جب حسن بصری کا ذکر آتا تو یوں گویا ہوتے: ان کا کلام انبیاء کے کلام سے ملتا جلتا ہے۔ اصحابِ

صحاحِ سِتّہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ حسن بصری نے بہت سی احادیث مرسلاً (جس میں صحابی کے واسطے کا ذکر نہ ہو) روایت کی ہیں۔ ایسی احادیث کی صحت کے بارے میں محدّثین کے درمیان اختلاف رہا ہے‘ بعض حضرات انہیں قبول کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک ان میں ضعف پایا جاتا ہے۔ امام ابن المدینی کا کہنا ہے کہ حسن بصری کی مرسلات اگر ثقہ راویوں سے مروی ہوں تو وہ صحیح ہیں اور بہت کم ساقط الاعتبار ہیں۔ ’تہذیب التہذیب‘ کے مطابق ابوزرعہ کا بیان ہے کہ وہ تمام احادیث جو حسن بصری نے ’’قال رسول اللہ ﷺ‘‘ کہہ کر (بلاواسطہ) روایت کی ہیں‘ میں نے تحقیق سے ان کو ثابت (صحیح) پایا سوائے چار احادیث کے (جن کی بنیاد مجھے نہیں ملی)۔ حسن بصریؒ نے ۱۱۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

(جاری ہے)

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت وتعارف اور حقوق ومطالبات
جیسے علمی وعملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفےٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے ، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت واَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبوی طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن
36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-(042)35869501
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

Sep 2021
Vol.70

Regd. CPL No. 115
No.9

Monthly **Meesaq** Lahore